ڈائرکٹوریٹ آف ڈِسٹینس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف جموّں

جموّں

کلاس: ایم۔اے: اُردو	سمسٹر: چہارم
کورس نمبر: 405	یونٹ: I & IV

پروفیسر (ڈاکٹر) محمد ریاض احمد
کورس کوآرڈی نیٹر، ایم۔اے، اردو، ڈی۔ڈی۔ای
صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈاکٹر افتخار احمد
ٹیچر انچارج، ایم۔اے، اردو
ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

(c) جُملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حِصّہ کسی شکل میں جموّں یونیورسٹی کی تحریری اِجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

زیر اہتمام: نظامت فاصلاتی تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

ڈاکٹر محمد آصف ملک

اسسٹنٹ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف اُردو

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری

PG-URDU

THIRD SEMESTER
COURSE CODE URD-405

Examination to be held in Dec. 2020, 2021 and 2022

TITLE OF THE COURSE : SPECIAL SYUDY OF IQBAL
CREDITS: 4

Maximum Marks: 100
a) Semester Exam: 80
b) Internal Assessment: 20 Marks

Objectives:

This course intends to make the students fully conversant with various aspects of Iqbal's life and literary personality. The evolution of his personality shall be studied in a manner in which variouse phases of his life and works. Systematic development of his thought and poetric evolution gets adequately projected. The course shall be divided in the following 4 Units :

UNIT-I Textual as well as critical study of the following Poems.

۱۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں ۲۔ طلوع اسلام
۳۔ مسجد قرطبہ ۴۔ تصویر درد

UNIT-II Textual as well as critical study of the following Ghazals.

۱۔ میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں ۲۔ اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
۳۔ کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش ۴۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
۵۔ زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا ۶۔ افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

UNIT-III Critical study of the following aspects of Iqbal's life and works.

۱۔ حیات و شخصیت ۲۔ اقبال کی اُردو شاعری کے ادوار
۳۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت

UNIT-IV Critical study of the following.

۱۔ تصورخودی ۲۔ تصورزماں ومکاں

۳۔ تصورعشق ۴۔ نظریہ فن

NOTE FOR PAPER SETTLER:

There are four units in the course No: URD-405

This paper shall be divided in the four Units viz Unit-1, Unit-2, Unit-3, and Unit-4.The Paper settler shall be set two question from each Unit asking candidates to attempt one Question from each Unit. The total number of question to be attemed in this Paper shall be 4. wich will Carry equal marks. Unit wise distribution of marks shall be as Unit-1=20, Unit-2=20, Unit-3=20,Unit-4=20. Total is 80. Distribution of Internal Assesments shall be two home = 10x20=20

Books Prescribed:

۱۔ بانگِ درا۔اقبالؔ ۲۔ضربِ کلیم۔اقبالؔ

۳۔ ارمغانِ حجاز۔اقبالؔ ۴۔کلیات۔اقبال

Books Recommended:

۱۔ روح اقبال،	از ڈاکٹر یوسف حسین خان
۲۔ ذکراقبال	ازعبدالمجید سالک
۳۔ اقبال	ازمجنوں گھورکھپوری
۴۔ اقبال کی نئی تشکیل	ازعزیز احمد
۵۔ اقبال اوراس کا عہد	ازجگن ناتھ آزاد
۶۔ اقبال اورمغربی مفکرین	ازجگن ناتھ آزاد
۷۔ اقبال بحیثیت شاعر	از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
۸۔ مردِکامل	ازمولاناعبدالسلام ندوی
۹۔ ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ وسال	از ڈاکٹر گیان چند جین
۱۰۔ اقبال سب کے لئے	از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ترتیب

یونٹ۔ I

☆ نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں _____ 5

☆ نظم طلوع اسلام _____ 9

☆ نظم مسجد قرطبہ _____ 16

☆ نظم تصویر درد _____ 22

☆ نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کی تشریح _____ 29

☆ نظم ''طلوع اسلام'' کی تشریح _____ 36

☆ مسجد قرطبہ کی تشریح _____ 43

☆ نظم ''تصویر درد'' کی تشریح _____ 47

یونٹ۔ II

☆ غزل نمبر ایک اور اس کی تشریح _____ 55

☆ غزل نمبر دو اور اس کی تشریح _____ 61

☆ غزل نمبر تین اور اس کی تشریح _____ 64

☆ غزل نمبر چار اور اس کی تشریح _____ 69

☆ غزل نمبر پانچ اور اس کی تشریح _____ 76
☆ غزل نمبر چھ اور اس کی تشریح _____ 82

یونٹ۔III

☆ علامہ اقبال حیات اور شخصیت _____ 85
☆ اقبال کی اردو شاعری کے ادوار _____ 89
☆ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے عناصر _____ 97

یونٹ۔IV

☆ تصور خودی _____ 102
☆ تصور زماں و مکاں _____ 107
☆ تصور عشق _____ 112
☆ نظریہ فن _____ 117

Unit-1

والدہ مرحوم کی یاد میں

ذرّہ ذرّہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے
علم و حکمت رہزن سامان اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دل آگاہ ہے
گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دار اشک عنابی نہیں
میرے لب پر قصۂ نیرنگیٔ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں خندہ نہیں گریاں نہیں
پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ یہ تردید میری حکمت محکم کی ہے
حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بہ پا اس نے کیا
عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں
بے تکلف خندہ زن ہیں ، فکر سے آزاد ہیں
پھر اس کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں
آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانہ برنا و پیر!!
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر!
کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت!
گلشن ہستی میں ماند تیم ارزاں ہے موت!
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں!
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ! غافل! موت کا راز نہاں کچھ اور ہے!
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے!
جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشت نوع انسان ایک ساعت ان کی ہے

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے
تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خودنمائی، خودفزائی کے لیے مجبور ہے
سردی مرقد سے بھی افسردہ ہوسکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں
دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے
پردہ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالہ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمست نوا کرتی ہے یہ
سینہ بلبل کے زنداں سے سرودآزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے باد صبح دم آباد ہے

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے!
ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
سازگار آب وہوا تخم عمل کے واسطے
نور فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکار انسانی نہیں

طلوع اسلام

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی
عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی
تڑپ صحن چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی
وہ چشم پاک ہیں کیوں زینت برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مرد غازی کی جگر تابی
ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے
سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ربود آں ترک شیرازی دل تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیث سوز و ساز زندگی کہہ دے
خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں فانی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سر گزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زور حیدر فقر بوذر صدق سلمانی
ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پایندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت پادشاہی علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے نگاہ پاک بینے جان بیتابے
عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خون شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبار رہ گزر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانان تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریان آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر پایندہ تر تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

تو رازکن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی
ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموز بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے باد بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہہ اطلس قبایان تتاری ہے
بیا پیدا خریدا راست جان نا توانے را
پس از مدت گزار افتاد برما کاروانے را

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد
سرت گردم توہم قانون پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخ کہن با نگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدرو حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد
دگر شاخ خلیل از خون ما نمناک می گردد
ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاک شہیرے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہال ملت ما سازگار آمد
بیا تا گل بفیشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

مسجد قرطبہ

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفی کائنات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفی
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرام عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات
اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود
قطرۂ خون جگر سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود

عرش معلی سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود
کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے
تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورش اصلاح دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں

حرف غلط بن گئی عصمت پیر کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتئ نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگر گوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذت تجدیدہ سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ
کعبۂ ارباب فن سطوت دین مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردان حق وہ عربی شہسوار
حامل خلق عظیم صاحب صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق و غرب
ظلمت یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب
آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

تصویر درد

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیات جاوداں میری نہ مرگ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
دریں حسرت سرا عمریست افسون جرس دارم
ز فیض دل طپیدن ہا خروش بے نفس دارم
ریاض دہر میں نا آشنائے بزم عشرت ہوں

خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محروم مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرف زیر لب شرمندۂ گوش سماعت ہوں
پریشاں ہوں میں مشت خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گرد کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں چھپایا مجھ کو مشت خاک صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں
نظر میری نہیں ممنون سیر عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس مے خانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے راز دانوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا

لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے
ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا

چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا
جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے
کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثال نقش پا تو نے
رہا دل بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرون محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے
فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے
تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
سراپا نالۂ بیدار سوز زندگی ہو جا
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے
صفائے دل کو کیا آرائش رنگ تعلق سے
کف آئینہ پر باندھی ہے او ناداں حنا تو نے
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے

غضب ہے سطر قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بت پندار کو اپنا خدا تو نے
کنویں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے
ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی
دکھا وہ حسن عالم سوز اپنی چشم پر نم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو رلواتا ہے شبنم کو
ذرا نظارہ ہی اے بو الہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو
اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو
شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروح الفت فکر درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو
محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے
دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا

علاج زخم ہے آزاد احسان رفو رہنا
شراب بے خودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکست رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا
تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیئے مثل حباب آبجو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا
شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
بیابان محبت دشت غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے
محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی کارواں بھی راہبر بھی راہزن بھی ہے
مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہے لیکن مرض ایسا

چھپا جس میں علاج گردش چرخ کہن بھی ہے
جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے
وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بے ستوں بھی کوہ کن بھی ہے
اجاڑا ہے تمیز ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے
سکوت آموز طول داستان درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تاب سخن بھی ہے
نمیگر دید کو تہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کی تشریح

''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' اقبال کی طویل نظم ہے۔ یہ نظم ۱۹۱۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اس نظم میں اقبال نے اپنے ذاتی غم کو اتنی وسعت اور بلندی بخشی کہ یہ غم صرف اقبال کا غم نہ رہ کر پوری ملت کا غم بن گیا۔ اقبال نے اپنی والدہ امام بی کے انتقال پر نظم لکھی۔ انھوں نے دل دوز مرثیہ کہا ہے۔ شروع کے چار اشعار سے اس کا بخوبی انداز ولگایا جاسکتا ہے۔ اقبال کے لیے پوری کائینات اور اس کے اندر محصور زندگی ''زندانی تقدیر'' معلوم ہوتی ہے۔ اپنے گردوپیش کا ذرہ ذرہ انھیں غم واندوہ سے معمور نظر آتا ہے اور وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی آزادی اور قوت ارادی محض ایک فریب ہے۔ انسانی کائنات ایک خاص نظام کی پابند ہے۔ وہ اسے ایک آفاقی قانون قرار دیتے ہیں۔ ایسا سخت قانون جس کے غلبہ سے کوئی شے پوری طرح آزاد نہیں ہے۔

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اس زنجیر عالمگیر میں ہر شے اسیر!

دوسرے بند میں مجبوری کے احساس کا سرچشمہ دل آگاہ کو قرار دیا ہے اور یہاں عقل و دل کے عنوان سے تضاد ابھر کر سامنے آیا ہے۔ انسانی قلب متضاد جذبات وکیفیات کی آماجگاہ ہے۔ ''رقص عیش وغم'' یا لطف وزیر و بم پر ہی انسانی عروج کا انحصار ہے لیکن علم وحکمت کی فراوانی عقل کی تاویلات اور منطقی انداز فکر انسانی جذبات کے سرچشموں کو خشک کر دیتے ہیں۔ عقلیت اور جذباتیت کے اس تضاد کو اقبال نے یوں پیش کیا ہے۔

علم وحکمت رہزن سامان اشک و آہ ہے
یعنی اک التماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے!
گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دار اشک عنابی نہیں

ایک طرف تو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی قوت ارادی کی کوئی حقیقت نہیں، دوسری طرف اس کے لیے جذبات کے تمام سہارے بھی منہدم ہو جاتے ہیں۔اس سے ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔

میرے لب پہ قصہ نیرنگی دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں ، خنداں نہیں ، گریاں نہیں

ماں کی تصویر سامنے آتے ہی اقبال کے خیالات بکھر جاتے ہیں اور وہ جو''حکمت محکم'' نے اب تک ایک سہارا دے رکھا تھا اس کا باقی رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمت محکم کی ہے

''گریۂ پیہم'' یا''گریہ سرشار''،''موج دود آہ'' اور''گنج آب درد'' یہ سب محاکات ہیں جن کے ذریعے نہ صرف جھوٹی منطق کو منھ کی کھانی پڑتی ہے بلکہ''بنیاد جاں'' پائندگی حاصل کرتی ہے اور''آئینہ دل'' غم والم کے گرد وغبار سے پاک ہو کر اپنی اصلی آب وتاب کو دوبارہ پالیتا ہے۔وقت کی پرواز کو مخالف سمت میں لے جانا اور حال کے لمحات کو گزرتے ہوئے زمانے سے وابستہ کر دینا۔

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پاپا اس نے کیا
عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اس سے اگلے بند میں ہم تصور کے طفیل ماضی کے فردوس گم گشتہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ماضی کی طرف یہ مراجعت یادوں کے دھندلے نقوش کو جلا بخشتی ہے اور حال کی گرفت کو ڈھیلا کر دیتی ہے جو ارتقا کے لازمی قانون کی وجہ سے ہمیں اپنے اندر اسیر کیے ہوئے ہے۔اس عمل کے دوران ہم اپنی موجود وحیثیت کو بھول کر بے ساختگی کے

ساتھ معصومیت کے دور اول میں پہنچ جاتے ہیں۔

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں ، فکر سے آزاد ہیں
پھر اس کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

یہاں بیک وقت ایک طرح کے سوز کا بھی اظہار ہے اور نفی ذات کا بھی۔ساتھ ہی ایک ایسے تجربے کی باز آفرینی کی گئی ہے جو حد سے زیادہ عمومیت رکھتا ہے اور جس کی صداقت میں شبہ نہیں۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے :

بے تکلف خندہ زن ہیں ، فکر سے آزاد ہیں
پھر اس کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

اس شعر میں جس عنصر کی طرف لگاؤ ہے اسے Nostalgia سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یعنی عہد طفلی کی طرف مراجعت۔دراصل ماضی کے ان دریچوں سے شاعر کے تخیل کی آنکھ ان رشتوں کی باز دید کرتی ہے جو اسے ماں کی پر شفقت اور عزیز از جاں شخصیت سے منسلک کرتے تھے۔

چھٹے بند کا آغاز ایک تحیر اور استعجاب کے احساس سے ہوتا ہے:

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانہ برنا و پیر!!
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر!
کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت!
گلشن ہستی میں ماند تیم ارزاں ہے موت!
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں!

اس کے بعد چار اشعار میں موت کی ہمہ گیری کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کائینات کے کسی بھی مظہر کو اس سے انکار نہیں کہ جاہ مرتبت اور قوت و اقتدار سے اسے ٹال نہیں جاسکتا۔نباتاتی، حیوانی اور انسانی کائنات میں ہر جگہ اس کی نفوذ کرنے والی کیفیت سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔اس کے باوجود موت کی حقیقت سے اب تک انسان کو آگاہی

حاصل نہیں ہوسکی۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جو اب تک حل نہیں کیا جاسکا۔

ساتویں بند سے ایک پرامید لہجے کا آغاز ہوتا ہے یعنی حیات بعد الموت کے تصور میں یقین۔ وہ اس شعر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے:

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں!
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں!

آٹھویں بند میں زندگی کی ہمہ جہتی کے تصور کو عیاں کرنا مقصود ہے۔ بے شک موت کا مہیب سایہ ہر شے پر پڑ رہا ہے لیکن موت کی بیدار زانی ہی اس کی کم مائیگی اور بے حقیقی پر دلالت کرتی ہے :

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ! غافل! موت کا راز نہاں کچھ اور ہے!
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے!
جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

نویں بند میں خیال کی ایک دوسری لہر ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ ہے کائنات اکبر اور کائنات اصغر کے مابین رابطہ اور تعلق کی نوعیت۔ مظاہر فطرت یا فطری کائنات جس درازی وقت کی اسیر ہے وہ انسانی عقل کو حیرت میں ڈال دیتی ہے:

عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگزشت نوع انسان ایک ساعت ان کی ہے

انسان کو خلاصہ کائنات کہا گیا ہے۔ کائنات میں انسان کے مرتبے اور مقام کا تعین دراصل اس کی ذہانت کے لافانی جوہر اور اس کی صلاحیتوں کے بے پناہ امکانات کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنے مثالی کردار کی ایک ہلکی سی جھلک یہاں بہت خوب صورتی سے پیش کی ہے:

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے

دسویں بند کے شروع کے پانچ اشعار میں مادے کی غیر فنا پذیری کے احساس کو نمایاں کیا گیا ہے۔ حیات جوہر فنا سے نا آشنا ہے لیکن اس کی ظاہری ان گنت شکلیں نوع بہ نوع انداز سے سامنے آتی رہتی ہیں :

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خودنمائی، خودفزائی کے لیے مجبور ہے
سردی مرقد سے بھی افسردہ ہوسکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

اس کائنات سے دوسری کائنات کی طرف سفر دراصل ایک طرح کی پرواز ہے اور موت اس پرواز کے لیے بال و پر فراہم کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس میں موت کے بے اصل ہونے کے تین دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ مرگ اور حیات نو کے اعمال متواتر اور متوازی طور پر پائے جاتے ہیں اور اگر یہ تخریب تعمیر نو پر فتح یاب نہ ہوتی تو شاید موت اس کائنات میں اتنی عام اور ارزاں نہ کی جاتی۔

دوسرے یہ کہ جب کائنات فطرت کے لیے ایک لامتناہی مدت مقرر ہے تو کوئی سبب نظر نہیں آتا کہ انسان جو عالم طبعی میں اپنے پوشیدہ امکانات اور گوناگوں کمالات کی وجہ سے افضل اور برتر ہے۔ دوام اور بھنگی کے عطیے سے محروم رکھا جائے اور تیسرے یہ کہ مادہ اور اس کے اجزائے ترکیبی اپنی ظاہری ہئیت کے اعتبار سے برابر منقلب ہوتے رہتے ہیں لیکن موت سفر زیست کی آخری منزل نہیں ہے بلکہ حیات، موت اور حیات بعد الموت ایک دوران مسلسل (Continuum) کے مختلف عناصر ہیں۔

گیارھویں بند کے شروع میں احساس ہوتا ہے کہ اقبال نے اس سے قبل تین بندوں میں موت کو بے اصل

اور بے حقیقت ثابت کرنے کے لیے جو معروضے قائم کیے اور جو مماثلتیں پیش کی ہیں وہ ان سب کی نفی کر رہے ہیں۔ یعنی ایک طرف وہ اس عام عقیدے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ''دروا جل'' لا دوا ہے لیکن :

زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا

اور اس کے برعکس اس کا دعوی یہ بھی ہے کہ :

وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

اس طرح غم فراق میں ایک طرح کی ابدیت پائی جاتی ہے:

دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے

بارھویں بند میں اقبال شام و صبح کی گردش پیہم سے موت و حیات کے تبدل پر استدلال کرتے ہیں۔ یہاں شب کی سیاہی استعارہ ہے عدم اور موت کا اور صبح کی سپیدی رمز ہے حیات نو کے اطلاع ہونے کا۔ صبح کا افق پر نمودار ہونا اعلان ہے اس امر کا کہ کائنات میں شب کی سیاہی اور اس کے لوازمات کا دور دورہ ختم ہو گیا ہے۔

پردہ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالہ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمست نوا کرتی ہے یہ
سینہ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے باد صبح دم آباد ہے

یہاں صبح جو ایک فطری مظہر ہے، ایک مثبت اور مرکزی استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور یہ اشارہ ہے زندگی کی توانائی اور تخلیقی قوت کا۔

تیرھویں اور آخری بند میں اقبال 'دام سیمین تخیل' کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کے ذریعے ماضی کے پر دوں کو اٹھایا جا سکتا ہے اور وقت کے لمحات کو جاودانی بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں پھر حیات کا تسلسل اس کی وحدت ہے جو مختلف منزلوں پر برابر اپنا اثبات کرتی رہتی ہے :

مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے!
ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
سازگار آب وہوا تخم عمل کے واسطے
نور فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکار انسانی نہیں

یہاں والدہ مرحومہ کی زندگی کو مہتاب سے تابندقرار دے کر جسم انسانی کے سفر کو صبح کے تارے سے خوب تر مظہر انا دراصل اشارہ ہے اس امر کا کہ موت کے بعد جسم ہر قسم کی آرائشوں سے منزہ ہو کر ایک طرح کی طہارت اور درخشندگی حاصل کر لیتا ہے۔آخر میں شاعر لحد کی حفاظت ونگہبانی کا طلب گار نظر آتا ہے۔

اقبال کی یہ نظم ایک ایسے تجربے سے عبارت ہے جسے تفکر کا مرکز ومحور بنایا گیا ہو۔ان کا فلسفیانہ مزاج اس کا متقاضی تھا کہ مرثیہ گوئی کے دوران وہ زندگی اور موت کی حقیقت کو بھی منکشف کرنے کی کوشش کریں۔ان کے یہاں اس بنیادی تجسس اور تقلیک کی علامات نظم میں جگہ جگہ ملتی ہیں اور استفہامیہ لہجے کا استعمال اکثر کیا گیا ہے۔اقبال کا مرکزی محرک حیات بعد الموت یا زندگی میں تسلسل کا یقین ہے گویا ظلم کے شروع اور درمیان میں بھی اس ذہنی کیفیت کو بخوبی نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے جو موت کی گرفت کے احساس سے انسان میں مرتب ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کے فانی ہونے کا نقش اس میں بین طور پر نظر آتا ہے۔

نظم ''طلوع اسلام'' کی تشریح

طلوع اسلام علامہ اقبال کے پہلے اردو شعری مجموعے ''بانگ درا'' کی آخری نظم ہے۔ اس نظم کو انہوں نے تخلیق کیا ہے۔ اس نظم سے قبل اقبال نے ایک بہت ہی اہم نظم ''خضر راہ'' لکھی تھی جب 1918 میں خلافت عثمانیہ کو شکست ہوئی اور اقبال نے 1919 میں خضر راہ لکھی جب کہ عالم اسلام مایوسیوں کے اندھیروں میں گھرا ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود اقبال کو امید کی ایک کرن نظر آ رہی تھی اور انہیں یقین کامل تھا کہ ایک دن ملت ضرور سربلند ہوگی۔ اس طرح اقبال کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، ترک رہنما مصطفی کمال پاشا نے سقاریہ کی جنگ میں یونانیوں کو شکست دے دی اور مسٹر گلیڈسٹن کا غرور خاک میں ملا دیا، تو اقبال خوشی اور مسرت سے سرشار ہو گئے۔ اس خوشی کا اظہار 1922 میں نظم "طلوع اسلام " لکھ کر کیا۔ اس نظم کے عنوان سے ہی یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ملت کے عروج کا سورج ایک بار پھر طلوع ہوتا ہوا نظر آیا۔ اقبال کا ہمیشہ رجائیت پر یقین رہا ہے اس لئے وہ رجائی شاعر کہلاتے ہیں، وہ کبھی مایوس اور ناامید نہیں ہوئے، لیکن اس نظم میں ان کی کچھ اور ہی کیفیت ہے۔ انہیں قوم و ملت کا کامرانی سے ہمکنار ہونا نظر آ رہا ہے۔ اس لیے تمام کی تمام نظم مسرت و شادمانی کے جذبے سے مملو ہے۔ اب ہم اس نظم کے ایک ایک بند کی تشریح کی طرف بڑھتے ہیں۔

اس نظم کا مرکزی خیال

اس نظم کا مرکزی خیال خود اس کے عنوان میں پوشیدہ ہے، اس کا پہلا بند مسرت اور شادمانی کے جذبات سے معمور ہے بلکہ تمام کی تمام نظم میں یہی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ اقبال نے ترک رہنما مصطفی کمال پاشا کی کامیابی کو ''طلوع اسلام'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''خضر راہ'' میں کہیں نہ کہیں ناامیدی اور مایوسی کا آمیزہ جھلکتا ہے لیکن اس نظم میں اقبال کا دل اس یقین سے لبریز ہے کہ اگر قوم و ملت اپنے باطن میں ایمانی قوت کو پیدا کر لے تو وہ پھر ساری دنیا کو فتح کر سکتی ہے:

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اس نظم کے کل نو بند ہیں۔ پہلے بند کا پہلا شعر ہی ان لفظوں میں عنوان کی وضاحت کر دیتا ہے کہ "افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی" اسی بند میں تھوڑا آگے چل کر اس یقین کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

یعنی پہلے بند میں شاعر نے ملت کو ترقی اور کامرانی کی خوشخبری سنائی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ملت کس طرح اپنی قوت کی معرفت حاصل کر لیتی ہے۔ اس بند کا ایک مصرعہ اس طرح، اس کی وضاحت کرتا ہے:

ع مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے

دوسرے بند میں مصطفی کمال پاشا کو "ترک شیرازی" کا لقب دیا گیا ہے۔ ان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اس لیے انہوں نے یونانیوں اور مغربیوں کو شکست دے کر ملت کو سربلند کر دیا تھا۔ یہ مشہورِ زمانہ شعر بھی اقبال نے پاشا کی شان میں کہا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس نظم کے تیسرے بند میں اقبال نے ملت کو اس کی بے پناہ اور قوی صلاحیتوں سے آگاہ کیا ہے۔ اقبال نے مسلمان کو خدا کی زبان، خدا کا ہاتھ، خدا کا آخری پیغام اور اسی نسبت سے اسے جاوداں اور ایشیائی اقوام کا پاسبان اور رہنما ٹھہرایا ہے۔ اقبال نے ملت کو یہ تاکید کی ہے کہ تو اپنے ظاہر و باطن کو پاک کر کیوں کے جلد ہی تجھ سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائے گا۔ اس کی وضاحت اس کلام کے ذریعے کی گئی ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس نظم کا چوتھا بند اسی تیسرے بند کی تعلیم و تربیت کی وضاحت کرتا ہے کہ جہانگیری اور جہانبانی کے لیے صداقت، عدالت اور شجاعت کی تربیت ضروری ہے۔ اخوت، محبت، اتحاد، حیدری زور بازو، ابوذر غفاری کا فقر، صدیق اکبر کی صداقت اور شاہین کی طرح پرواز؛ یہ وہ اوصاف حمیدہ ہیں جو مرد مومن کے لیے ضروری ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی

پانچویں بند میں بھی اسی خیال و جذبے کی توسیع کی ہے۔ کہا گیا ہے کہ مسلمان کو مساوی حقوق کے سبق کو یاد رکھنا چاہیے۔ بندہ اور آقا میں امتیاز کرنا بربادی کا سبب ہے۔ لالچ اور ہوس جو دلوں میں بت تراش لیتی ہے۔ ان قومی، اونچ نیچ، ذات پات، فرقہ واریت کے بتوں کو توڑنا ضروری ہے۔ بالآخر اس بات پر زور دیا ہے کہ زندگی میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے لیے نہ ٹوٹنے والا یقین، مسلسل جدوجہد اور اخوت و محبت درکار ہے:

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

نظم کا چھٹا بند خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں ترکوں کی فتح و کامرانی کا بیان ہے۔ یہی وہ فتح تھی جس نے اقبال سے یہ معرکہ آرا نظم تخلیق کرائی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ برطانیہ سے خفیہ ساز باز اور امداد پا کر یونانی اس طرح ترکوں پر جھپٹے تھے جس طرح عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ ان کے پاس آبدوز کشتیاں تھیں، ان کی فوجوں کے پاس لاسلکی نظام (وائرلیس) تھا، وہ جدید ترین اسلحہ سے مسلح تھیں لیکن ترکوں کی قوت ایمانی کے سامنے کچھ بھی کام نہ آیا اور انہیں شکست فاش ہوئی۔ اقبال اہلِ ایمان کی قوت مخصوصہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے!
یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے!
جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

ساتویں بند میں مسلمان سے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندی مسلمان سے خطاب کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح ترک اپنی قوت بازو کا اندازہ کر کے اندر آزاد اور سرخرو ہو گئے، اسی طرح تو بھی بری رسومات سے آزاد ہو سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تو پیغام خداوندی کو سمجھ لے، اپنی خودی کی معرفت حاصل کر یعنی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچان لے، زندگی کی جنگ میں فولاد کی صورت سخت جاں ہو جائے، معاملات مہر و فا میں ریشم کی طرح نرم ہو جائے اور فرقہ واریت، رنگ و نسل کے امتیاز کو فراموش کر کے اتحاد و اتفاق کا راستہ اختیار کر لے۔ اس بند کے چند مخصوص شعر یہ ہیں:

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام وسحر سے جاوداں ہو جا

مصاف زِندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیل تندرو کوہ و بیاباں سے
گلستان راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

آٹھویں بند میں اقبال نے ملوکیت، سرمایہ داری، تہذیبِ مغرب اور سائنس کی ایجادات کو بیان کیا ہے جو دنیا کو تباہ کرنے کے لئے اسلحہ فراہم کرتی ہے۔ ان تمام کی انہوں نے شدید الفاظ میں مذمت کی ہے اور مسلمان کو یاد کرایا ہے کہ اصل زندگی وہ ہے جو اچھے اعمال پر مبنی ہے کیونکہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس بند کا آخری شعر اور نواں بند فارسی میں اقبال نے تخلیق کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے مردِ مسلمان آج دنیا تیرا پیغام سننے کے لیے گوش برآواز ہے، اٹھ کھڑا ہو اس موقع کو غنیمت جان اور اپنی تعلیمات کو عام کر دے۔ آخری بند میں شاعر کے دل کی اضطرابی کیفیت اور جوش و جذبے کی فراوانی ہر لفظ سے پھوٹ پڑتی ہے۔ شاعر مسرت کے عالم میں جھوم رہا ہے کہ اجڑے گلشن میں پھر سے بہار آئی، آبشار پھر سے بہہ نکلے، خوش نوا پرندے ایک بار پھر سے نغمہ سنج ہو گئے۔ یہ نغمے کیا ہیں؟ دراصل وہ پیغام ہے جو اس جہانِ رنگ و بو میں انقلاب برپا کر دے گا اور بلبل ہزار داستان کی نغمگی دوبارہ سے سنائی دینے لگی ہے۔ یہ بلبل ہزار داستان درحقیقت شاعر اقبال ہے۔

نظم کا فنی جائزہ:

یہ نظم ''طلوع اسلام'' جو اقبال نے، ترک رہنما مصطفی کمال پاشا نے جب یونانیوں پر 1922ء میں فتح حاصل کی تھی، تب فرحت وخوشی کے عالم میں لکھی تھی۔ اگر اقبال کی اس نظم کو فنی اور جمالیاتی نقط ؟ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا

ہے کہ یہ ان کی بہت سی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔ خیال رہے کہ ان کی یہ تخلیق ان کے شعری مجموعہ ''بانگ درا'' کی آخری نظم ہے جس کی اشاعت 1924 میں ہوئی تھی۔ ''بال جبریل'' اس زمانے کے بعد کا شعری مجموعہ ہے۔ جو پختگی ان کی نظم ''مسجد قرطبہ'' میں ہے اس نظم میں نہیں ہے لیکن اس کے باوجود طلوع اسلام ایک اہم اور کامیاب نظم ہے۔ یہ نظم اقبال کے فکر وفن کے سفر میں سنگ میل سے کم درجہ نہیں رکھتی۔ یوسف سلیم چشتی کی رائے اس نظم کے حوالے سے یہ ہے:

> ''میری رائے میں بندش اور ترکیب، مضمون آفرینی اور بلند پروازی، رمز وکنایہ کی فراوانی اور مشکل پسندی، شوکت الفاظ اور فلسفہ طرازی غرضکہ صوری اور معنوی محاسن شعری کے اعتبار سے یہ نظم بانگ درا کی تمام نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔''

اس نظم کی ایک خاص صفت ہے جو اس کو دیگر نظموں سے ممتاز کرتی ہے وہ مسرت انگیز کیفیت ہے جو آغاز سے اختتام تک نظم پر چھائی ہوئی ہے۔ درحقیقت یہ نظم کیف وسرور کے عالم میں تخلیق ہوئی ہے۔ پہلی جنگ عظیم 1914 سے لے کر 1922 تک ملت اسلامیہ پر بڑا برا وقت رہا ہے، اسی طرح دیگر ممالک میں بھی مدت سے پریشانی کے عالم میں تھے۔ مدتوں کے بعد ملت اسلامیہ کے اقبال کا ستارہ فتح سمرنا کی شکل میں چمکا تو اقبال خوشی سے جھوم اٹھے، اسی عالم وجد میں یہ نظم انجام کو پہنچی ہے۔

نظم کی ہیئت:

اقبال کی پسندیدہ ہیئت ترکیب بند ہے۔ اقبال نے جس طرح اپنی بہت ساری دیگر نظموں کو ترکیب بند ہیئت میں تخلیق کیا ہے اسی طرح اس نظم طلوع اسلام کو بھی ترکیب بند ہیئت میں ڈھالا ہے۔ ترکیب بند میں متعدد بند ہوتے ہیں اور ہر بند گویا ایک علیحدہ غزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہی غزل کا سا قافیہ اور ردیف، سب مصروں کا ایک ساوزن، ہر شعر اپنی جگہ پر الگ بھی ہے اور بند کے سارے شعر کسی خیال کی ڈور میں بندھے ہوئے بھی ہیں۔ اس نظم میں پیکر تراشی کے عمدہ نمونے بھی موجود ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ شاعری موسیقی سے زیادہ مصوری ہے۔ وہ شعر زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا تجربہ بیان نہ کرے بلکہ جو کچھ اس کی چشم تصور نے دیکھا ہے وہ لفظی پیکر تراشی کے ذریعے دوسروں

کو بھی دکھادے۔ چند اشعار دیکھیں:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی

ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی

اس نظم میں استعارہ اور تشبیہ اور علامات کا حسین برتاؤ ہوا ہے۔ طلوع اسلام سے اس کی بہت ساری مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اس حوالے سے دوسرے اور چھٹے بند کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے:

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس نظم کے چند علامتی شعر ملاحظہ ہوں:

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

براہیمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

اس نظم کا موضوع اگرچہ ہنگامی ہے یعنی یہ نظم مخصوص حالات و کیفیات اور ایک مخصوص واقعے یعنی ترک رہنما مصطفیٰ کمال پاشا کی کامیابی اور فتح سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ لیکن خیالات، حالات میں انقلابات کے باوجود یہ نظم زندہ رہی ہے تو اس لیے کہ عظیم شاعری کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس میں ڈھالے افکار و جذبات بے معنی و بے مصرف بھی ہو جائیں اس کے باوجود قارئین کی دلچسپی کا سبب بنے۔ اقبال کی یہ نظم آج بھی بڑے ہی ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی اور سمجھی جاتی ہے یہی ایک شاعر کا فنی کارنامہ ہے۔

☆☆☆

مسجد قرطبہ کی تشریح

مسجد قرطبہ اقبال کی اہم ترین نظم ہے جو سفر ہسپانیہ کے دوران 1933ء میں وجود میں آئی۔ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس لوٹ رہے تھے تو اس دوران انھوں نے فرانس، اسپین اور اٹلی کی سیاحت کی تھی۔ وہ جنوری 1933ء میں ہسپانیہ پہنچے۔ اقبال اپنے یادگار سفر ہسپانیہ کے بارے میں شیخ محمد اکرام کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر بھی لکھی۔ الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔"

اقبال نے اسپین کے معروف شہر قرطبہ کی نہ صرف زیارت کی بلکہ نفل نماز بھی ادا کی اور ایک روایت کے مطابق اقبال نے مسجد میں اذان بھی دی۔ ہسپانیہ کی سرزمین قرطبہ کے اس مقام پر اقبال نے دو نظمیں 'دعا' اور مسجد قرطبہ لکھیں۔ قرطبہ اسپین کا معروف شہر رہا ہے جو بھی مسلمانوں کی حکومت میں صدر مقام ہوا کرتا تھا۔ قرطبہ ۱۱۷ھ میں مسلمانوں کی حکومت میں شامل ہوا اور عبدالرحمن اوّل نے اسے دارالخلافہ بنایا۔ اس شہر کی جامع مسجد کے طور پر اس کی سنگ بنیاد رکھی گئی اور مختلف بادشاہوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا اور اس کی آن بان کے ساتھ ساتھ اس کے حسن و جمال میں بھی بے حد اضافہ کیا۔ اقبال نے مسجد قرطبہ علامت کے طور پر لکھی ہے۔ ہسپانیہ جہاں مسلمانوں کا عروج تھا لیکن چھ سو برس حکومت کے بعد عیش و عشرت کی زندگی ان کی بربادی کا سبب بنی۔ مسلمانوں کو ملک بدر کیا گیا اور یہ تاریخی مسجد اذان سے بھی محروم ہوگئی۔

مسجد قرطبہ کا آغاز وقت کے تصور سے ہوتا ہے۔ یہاں اقبال نے زمان و مکان کے نظریہ کو پیش کیا ہے۔ وقت کا ایک خارجی مظہر یا روپ روز و شب کا پے در پے تواتر اور پیہم سلسلہ ہے۔ اس کے ذریعے واقعات کا وہ ڈھانچہ

Structure of events ترتیب پاتا ہے جسے حقیقت سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔زندگی اور موت جو وجود کے دو انتہائی نقطے ہیں ۔وقت کے چوکھٹے کے بالمقابل ہی بامعنی معلوم ہوتے ہیں ۔اقبال وقت کو صرف نقش گر حادثات ہی نہیں کہتے بلکہ سلسلۂ روز وشب کو اصل حیات وممات بھی قرار دیتے ہیں ۔اس سے ان کا منشا دراصل اس امر پر زور دینا ہے کہ وقت حقیقی ہے ۔روز وشب کا سلسلہ دو مختلف رنگوں کے تار و پود کے مانند ہے جس کے ذریعے ذات کا مخصوص تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز وشب، تار حریر دورنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

مسجد قرطبہ میں عشق اور فن دونوں وقت کے اس تصور کے خارجی مظاہر میں جو ابدیت کے مترادف ہے۔ اقبال وقت کو ایک تخلیقی عضوی یعنی ORGANIC اور ناحیاتی قوت مانتے ہیں ۔یہ ایک خط مستقیم کے مماثل نہیں بلکہ ایک جو رواں ہے ۔اس میں ماضی، حال اور مستقبل مخلوط ہیں ۔ان کے مابین تمیز، تفریق اور تقسیم ممکن نہیں اور یہ وقت اپنی ماہیت اصل میں عشق کی توانائی سے کچھ بہت مختلف ہیں ۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے میں بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام!
عشق دم جبرئیل ، عشق دل مصطفی
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہباخام ، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!

اقبال عشق کا ایک ہمہ گیر اور جامع تصور رکھتے ہیں۔عشق ایک سرحدی مسلسل، حیات آفریں لہر ہے جو نہ صرف سوز و سائز زندگی کو متحرک کرتی ہے بلکہ اس کے بہاؤ کو قائم بھی رکھتی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جو زندگی کے امکانات کی امین محافظ اور اس کی توانائیوں کی توسیع کرتی ہے۔

وقت اور عشق کے مضمرات کو نمایاں کرنے کے بعد اقبال نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسجد قرطبہ کے پیکر سنگ وخشت میں عشق کا جذبہ کارفرما ہے۔

ساتھ ہی اقبال نے مرد مومن کے متعلق کہا ہے کہ وہ مکان کی حد بندیوں سے ماورا ہے اور بے نیاز، اور اس کے سلسلوں کا کوئی کنارہ نہیں۔تاریخ انسانیت میں اسکا ایک منفرد مقام ہی نہیں رہا ہے بلکہ اس سے تاریخ کی منتشر اور پراگندہ قوتوں کی شیراز و بندی کا کام بھی انجام دیا ہے۔اس کے دل میں توحید الٰہی کا خیال اس درجہ جاگزیں تھا کہ وہ ہما سوا کے غلبے اور توسط سے ہمیشہ بے نیاز رہا۔

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لَا اِلٰہَ
سایہ شمشیر میں اس کی پنہ لَا اِلٰہَ

اقبال مرد مومن کی شخصیت کے بعض آثار کی جھلک دکھاتے ہیں۔"مسجد قرطبہ ان کے نزدیک ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں یہ تصویر اپنی پوری آب و تاب، توانائی اور تازگی اور قوت وشوکت کے ساتھ عکس افگن ہے۔ اقبال مسجد قرطبہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور اسے کعبۂ ارباب فن اور سطوت دین بین کے ناموں سے یاد کر کے اس کی علامتی حیثیت کو نمایاں کرتے ہیں۔اقبال کو فن تعمیر کے اس شاہکار میں جو لطیف، نازک اور مرتعش حسن نظر آتا ہے اس کی مثال صرف مرد مومن کے قلب سلیم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مسجد قرطبہ کے توسط سے اقبال کے ذہن میں نہ صرف اپنی مسلمانوں کے ماضی کے نقوش اجاگر ہو جاتے ہیں بلکہ وہ مستقبل میں اس کی تہذیبی آبادکاری کے بارے میں بھی سوچنے لگتے ہیں۔اسی سبب سے نظم کا ساتواں بند ایک پیغمبرانہ لب ولہجہ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔یعنی ان پر ایک طرح کی فکر انگیزی کی کیفیت غالب آنے لگتی ہے لیکن اس بند کے آخر میں پیغمبرانہ لب و لہجے میں اعتدال اور ٹھہراؤ برتنے کے باوجود ایک طرح کا تناؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔آخری

اور آٹھویں بند میں اقبال اپنے گرد و پیش پر نظر میں دوڑاتے اور اس کا جائزہ لیتے ہیں اور فطرت کی حسین اور گوناگوں نقش گری سے گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

اس نظم میں بنیادی کردار دراصل تین ہیں۔شاعر، وقت اور ابدیت۔ یہ ابدیت اپنا محور تبدیل کرتی رہتی ہے یعنی میں بھی دوران محض کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے کبھی عشق کے محرک کے طور پر اور بھی مرد مومن کی شخصیت کے پرتو کے بطور اور بھی مسجد قرطبہ کے روپ میں۔

مسجد قرطبہ کے ہر بند کا موضوع الگ ہے لیکن تمام موضوعات مل کر ایک وحدت کی تشکیل کرتے ہیں جس کا موضوع اسلام پر مبنی ہے۔مسلمانوں کے عروج و زوال سے شروع ہو کر یہ نظم مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی جد و جہد کا درس دے کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نظم نظریہ زماں و مکاں نظریہ عشق، کائنات کے تکوینی نظام مسجد قرطبہ کے جلال و جمال، مرد مومن کے تصورات وغیرہ پر مبنی ہے۔اس میں اقبال کا فلسفہ پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔وہ نظم کا آغاز وقت کی بے رحمی سے کرتے ہیں۔وقت ہر چیز، ہر شے اور اس سے وابستہ آثار کو ملا دیتا ہے لیکن عشق کے تحت جو چیز میں وجود میں آتی ہیں وہ ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔

مسجد قرطبہ کو مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں کہ اس کی تعمیر مرد مومن کے ہاتھوں سے ہوئی اس لیے وہ قائم و دائم ہے۔وہ ان مومنوں کی تعریف بھی کرتے ہیں جو واقعی مرد مومن ہوتے ہیں۔اس کے کارنامے، اس کی یادوں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔اقبال نئے انقلاب کی آمد کی خبر بھی دیتے ہیں اور مسلمانوں کو ایک احیائے اسلامی کا خواب دکھاتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ خواب کی تعبیر اسی وقت سامنے آسکتی ہے جب مسلمان اپنے اعمال کا حساب کریں اور مرد مومن بنیں۔

نظم ''تصویر درد'' کی تشریح

یہ نظم علامہ اقبال نے 1904 کے آغاز میں لکھی تھی جب ان کی عمر 30 سال کے آس پاس تھی۔ 1857 کے بعد ہندوستان کے اندر جو حالات پیدا ہوئے، کہ ہندوستانی انگریزوں کے غلام بن گئے، برطانوی حکومت کا ظلم واستبداد مسلسل ہندوستانیوں پر جاری رہا، یہاں تک کہ لوگ ذلت وخواری کی زندگی میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں کے باشندے جب کبھی متحد ہو کر آزادی کی مہم شروع کرتے تو برطانوی حکومت اور ان کے ہاتھوں بکے ہوئے لوگ ہندوستانیوں کو ذات، برادری، رنگ ونسل اور مذہبوں کی لڑائی میں بانٹنے کی کوشش کرتے، ہندوستانی بعض اوقات ان سازشوں کا شکار ہو جاتے اس طرح آزادی کی مہم ذرا کمزور پڑنے لگتی۔ ان سب کو اقبال کے دل نے محسوس کیا، اس کا مشاہدہ کیا، اپنی دانش کا استعمال کیا، ان تمام حالات کو اپنی نظم ''تصویر درد'' میں کامیابی سے ڈھالنے کی کوشش کی۔ اقبال ابھی یورپ نہیں گئے تھے اس وقت اقبال وطن دوستی کے جذبات سے سرشار تھے، وہ ہندوستان کی مختلف اقوام اور مذاہب کے ماننے والوں کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی میں ہندوستان کی آزادی اور اس کی ترقی مضمر تھی، اس پر ہر ہندوستانی کو وہ متنبہ کر رہے تھے کہ وہ سازشوں کا شکار نہ ہوں اور متحد ہو کر اپنے مقصد کی طرف بڑھیں۔ اس نظم میں اقبال ایک وطن پرور (نیشنلسٹ) بن کر قوم ہندوستان کے سامنے آتے ہیں۔ جو رنگ ان کی نظموں ہمالہ، نیا شوالہ، ترانہ ہندی میں موجود ہے وہی رنگ و جذبہ پوری شدت کے ساتھ اس نظم تصویر درد میں بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے دلی جذبات کی پوری شدت کے ساتھ اہل وطن کی نفاق انگیز روش پر نوحہ خوانی کی ہے اور انہیں نہایت بے باکی کے پیرائے میں بیدار اور متنبہ کیا ہے کہ اہل ہند اگر تم نے آنے والی مصیبتوں کا اندازہ کر کے آپس میں اتحاد نہ کیا تو تم مٹ جاو گے، تمہارا نام بھی باقی نہیں ہوگا:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس نظم کے پہلے بند میں اقبال نے تمہید یہ کلام کے ساتھ ساتھ اپنے درد کو بیان کیا ہے کہ میری داستان اس قدر

المناک ہے کہ کوئی بھی اس کے سننے کی تاب نہیں لا سکتا، اس لیے میں نے خاموشی اختیار کر لی ہے، قوم کے افراد اس قدر بے حس و بے شعور ہیں کہ وہ میری فریاد، میرا درد سننا ہی نہیں چاہتے۔ میری بات کوئی سننے والا نہیں ہے۔ اے خدا ان حالات میں اس دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا ہے لیکن نہ زندگی میرے اختیار میں ہے اور نہ ہی موت، اگر زندگی میرے اختیار میں ہوتی تو میں ہمیشگی کی صفات پیدا کر لیتا اور اگر موت اختیار میں ہوتی تو دنیا سے چل بستا۔ میری آہ وفغاں اور بربادی صرف میری ہی بربادی نہیں بلکہ ساری کائنات کی بربادی ہے۔ اس بند کے آخری شعر کو وہ فارسی میں اس طرح تخلیق کرتے ہیں:

دریں حسرت سرا عمریست افسون جرس دارم
زفیض دل تپیدن ہا خروش بے نفس دارم

مطلب یہ کہ اس دنیا میں ایک عرصہ دراز سے میری کیفیت وہی ہے جیسی جرس کی ہے، یعنی بظاہر وہ خاموش ہے لیکن اس کے باطن میں ایک شور پوشیدہ ہے۔ عشق سے دل میں تپش پیدا ہوتی ہے اور اس تپش دل کا نتیجہ یہ ہے کہ میری ذات خروش بے نفس کا خزینہ بن چکی ہے یعنی میرے سینے میں آہ وفغاں کا ایک طوفان پوشیدہ ہے لیکن بظاہر میں خاموش ہوں۔

نظم کے دوسرے بند میں راست طور پر شخصی رنگ موجود ہے اس میں شاعر اپنی شخصیت اور اپنے مقام کی وضاحت کرتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ مجھے دنیا کی خوشیوں سے کوئی حصہ نصیب نہیں ہوا بلکہ خوشی بھی میری محرومی پر آنسو بہاتی ہے۔ اسی طرح گویائی میری کم نصیبی پر ماتم کناں ہے کہ کوئی فرد میری درد بھری داستان سننے کے لئے تیار نہیں، میں بہت ہی سنجیدہ ہوں لیکن اس مشکل کو حل نہیں کر سکتا کہ میں کون ہوں؟ سکندر ہوں یا آئینہ یا گردکدورت ہوں؟ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محورِ موجوات اور مرکز کائنات ہوں، میری ہستی قدرت کا مقصد ہے اگر میں نہ ہوں تو یہ ساری فطرت بے کار ہو کر رہ جاتی:

پریشاں ہوں میں مشت خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

اقبال انسان کی عظمت واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔ اگر اس کائنات کو میخانہ فرض کیا جائے تو انسان نہ تو شراب ہے نہ ساقی نہ مستی ہے نہ پیمانہ ہے بلکہ اس مے خانے میں جس قدر اشیا نظر آرہی ہیں انسان ان سب اشیا کی حقیقت ہے۔اس بند میں اقبال انسان کو اس کی معرفت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

تیسرے بندے اقبال نے اہل وطن ہندوستانیوں کو باخبر کیا ہے کہ وہ اگر دور حاضر کے تقاضوں سے اسی طرح بے خبر رہے تو بربادیوں کا نزول یقینی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ خدا نے مجھ کو صف شعرا میں وہ بلند مقام عنایت کیا ہے کہ میں فرشتوں کا ہم زبان ہوں اور میرا دل قضاو قدر کے بھیدوں کا آئینہ ہو چکا ہے۔اس کے بعد وہ ہندوستان سے مخاطب ہوتے ہوئےکہتے ہیں کہ تیرے باشندوں کا طرز عمل وقت کی مصلحت کے خلاف ہے بلکہ اس قدر خوفناک ہے کہ میں آئندہ کے مصائب کا تصور کر کے کانپ اٹھتا ہوں اور بے ساختہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔اگر باغبان (ہندو مسلم) اسی طرح آپس میں دست و گریباں رہے تو گلچیں (انگریز) اس باغ (ہندوستان) کو ضرور تباہ کر دے گا۔اس کے بعد اہل وطن سے خطاب کرتے ہیں کہ دشمن تمہیں تباہ و برباد کرنے کی سازش میں مصروف ہے۔اس لئے عہد کہن کی داستانوں کو بھلا دو جو فرضی ہیں، صرف اور صرف فساد کے لیے گڑھی گئی ہیں تا کہ رنگ و نسل اور مذاہب میں کے مابین منافرت پیدا ہو سکے۔

اے اہل وطن (ہندوستانیو) ایسے ناپاک ارادے رکھنے والے لوگوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو جو ہندوستان کی رنگا رنگ عوام میں منافرت پیدا کر رہے ہیں۔اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یقین جانیے تم مٹ جاو گے کیونکہ آئین فطرت و قدرت یہی ہے کہ خدا اس فرد کی مدد نہیں کرتا جو امن و امان قائم کرنے کے لیے جدو جہد نہیں کرتا:

یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

چوتھے بند میں اقبال نے اپنے عزم مصمم کا اظہار کیا ہے کہ میری بات کوئی سنے یا نہ سنے میں پھر بھی سناتا رہوں گا، اس ملک ہندوستان سے نفرت اور عداوت کی تاریکی کو ضرور دور کروں گا، اپنی تمام قوتوں سے اہل وطن کو بیدار اور باخبر کرنے میں عمر صرف کر دوں گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ منتشر افراد کو متحد کرنا، ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا مشکل ترین عمل ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ مشکل کام کو آسان بنا سکوں اور اقوام ہند میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جائے۔ میں تمام ہندوستانیوں کو وطن سے محبت کرنے کا سبق پڑھاوں گا اور جو راز مجھ پر کھل چکے ہیں ان کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اتحاد ہی سے ہم کامیاب ہو سکتے ہیں اس کو سب اہل وطن پر ظاہر کروں گا:

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا جہاں کو جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

پانچویں بند میں اقبال نے تمام ہندوستانیوں خواہ وہ کسی بھی ذات برادری یا مذہب و دھرم سے تعلق رکھتے ہوں، مخاطب کیا ہیاور محبت کے جذبے کو عام کرنے کی تلقین کی ہے کہ اپنے خیالات اور اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کریں، بلند مقاصد کے لیے آگے بڑھیں اور تعصب، فرقہ واریت کو بالکل اکھاڑ پھینکیں۔ کہتے ہیں کہ میری بات سننے پڑھنے والے! مجھے افسوس ہے کہ تو نے اپنے خیالات میں بلندی پیدا نہیں کی، تمام عمر رذلیل اور پست خیالات میں گزار دی ہے، تو اپنی جماعت، مذہب اور فرقہ کے تنگ حلقے میں محصور ہو گیا ہے۔ دیگر قوموں اور دیگر ممالک کی طرز زندگی کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی تو نے کبھی اپنی حقیقت پر غور و فکر کیا کہ خدا نے تجھے کس بلند مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، اگر تو دنیا میں عزت و عظمت کا متمنی ہے تو تعصب کو اپنے دل سے نکال دے۔ جن لوگوں کو تو برا سمجھتا ہے وہ لوگ درحقیقت تیرے بھائی ہیں، تو محض دنیا کی لالچ میں پھنسا ہے تیرا خیال ہے کہ اس طرح تجھے دل کی صفائی نصیب ہو گی! ہرگز

نہیں۔ تیرا یہ عمل ایسا ہی بے سود ہے جیسے کوئی فرد آئینے پر مہندی لگائے اور اسے رنگین کرنے کی کوشش کرے۔ دانشمند انسان جانتا ہے کہ اس آئینہ پر مہندی کا رنگ کبھی نہیں آسکتا اسی طرح وہ واعظ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو ممبر پر بیٹھ کر اگر وعظ و نصیحت کرتا ہے تو تیری ذمہ داری ہے کہ تو ساری قوم کو دا اقوامِ عالم کی محبت کا درس دے لیکن تیرا حال یہ ہے کہ تیری نصیحت میں بھی افسانوی رنگ ہی ہوتا ہے۔ اقبال اس طرح گویا ہیں:

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
صفائے دل کو کیا آرائش رنگ تعلق سے
کف آئینہ پر باندھی ہے او ناداں حنا تو نے
ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

چھٹے بند میں اقبال نے پانچویں بند کے خیالات مزید تاکید اور وضاحت سے بیان کئے ہیں اور دلیل کے ساتھ اپنی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اے مخاطب اپنی فکر و نظر میں وسعت پیدا کر اور پروانے کی طرح ہو جا کہ یہ پروانہ کسی مخصوص شمع سے محبت نہیں کرتا بلکہ وہ تو روشنی سے محبت کرتا ہے خواہ وہ روشنی دیر میں ہو یا حرم میں:

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشم پُرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو رولاتا ہے شبنم کو
شجر ہے فرقہ آرای تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

ساتویں بند میں اقبال نے اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مہربانی کا معاملا کرو لیکن اس کے صلے اور عوض کی تمنا مت رکھو۔ محبت کرو لیکن اس کا اجر صرف اور صرف مالک حقیقی سے طلب کرو، اگر تم دوسروں سے محبت سے پیش آو گے تو تمہاری تمام تکلیفیں اور زحمتیں خود بہ خود دور ہو جایں گی اگر اس سلسلے میں کوئی تکلیف پہنچے تو کسی سے شکایت مت کرو۔

اے سننے والے اگر تجھے دنیا میں عزت و عظمت کی خواہش ہے تو اپنی قوم سے بے پروائی اختیار نہ کر، نوع

اِنسان کی محبت ایسی شراب ہے کہ آدمی ساغر وصراحی کے بنا بھی سرمست رہ سکتا ہے، اگر آپ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ پر یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی ترقی کا راز یہ ہے کہ ان کے افراد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں:

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پرواہ اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

اس نظم "تصویر درد" کے آخری اور آٹھویں بند میں اقبال نے محبت کی حقیقت اور فلسف ؟ محبت کو بیان کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ محبت مجموعہ اضداد ہے، اس کے رموز واسرار انسان کی فہم سے بالاتر ہیں۔ یہاں تک کہ اگر فرد قوم کی محبت میں ترکِ وطن بھی کر دے تو پردیس میں بھی اپنے وطن کی حسین کیفیات سے لطف اٹھا سکتا ہے، قفس میں رہ کر بھی وہ چمن کی لطافتوں سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اپنے وطن کی ترقی کے سلسلے میں قید و بند کی سختیاں برداشت کرتے ہیں وہ تمام تکالیف کے باوجود بھی راحت محسوس کرتے ہیں۔

آگے وہ کہتے ہیں کہ عام تاثر یہ ہے کہ لوگ محبت کو مرض خیال کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسا مرض ہے جو قوم کے تمام امراض کا مداوا کر دیتا ہے۔ اس محبت کے سبب تمام مصیبتوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص محبت کی آگ میں اپنے دل کو کباب کرتا ہے تو اس کا دل نور ہو جاتا ہے۔ جس شخص کا دل محبت کی آگ سے جل اٹھتا ہے تو وہ شمعِ انجمن ہو جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ پھر سارا جہان اس پر پروانے کی طرح جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

اے انسان تمام کائنات خدا کا مظہر ہے، ہر شے میں اسی کا حسن نمایاں ہے، شیریں بھی اسی کے حسن کا مظہر ہے اور فرہاد بھی۔لیکن یہ خیال رہے کہ جن قوموں کے افراد نے آپس میں نفرت کو روا رکھا ہے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہیں۔ خدا کرے کہ میرے ہم وطن اس راز سے واقف ہو جائیں، میری یہ دردناک داستان بہت طویل ہے لیکن یہاں آ کر میں خاموشی کو مناسب خیال کرتا ہوں:

مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاج گردش چرخِ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمع انجمن بھی ہے
وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شریں بھی ہے گویا بے ستوں بھی کوہکن بھی ہے

آخر میں نظیریؔ کے ایک شعر پر اقبال اس نظم کو تمام کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ میری داستانِ درد چونکہ بہت طویل ہے، اس قدر طویل ہے کہ اس کی کوئی انتہا ہی نہیں، اس لیے میں نے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا ہے:

نمی گردید کوتہ رشتہ معنی رہا کردم
حکایت بودے پایاں بخاموشی ادا کردم

☆☆☆

عمومی جائزہ:

نظم ''تصویر درد'' اقبال نے 1904 میں اس وقت لکھی جب وہ 1857 کے بعد ہندوستان اور ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک کیا، اس سے متاثر ہوئے۔ ہندوستانی غلامی کی کرخت اور المناک سانسیں لے رہے تھے، یہ ہندوستانی قوم جو سارے عالم میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی وہ انگریزوں کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہو رہی تھی۔ ہندوستانی جو افراد اس غلامی سے آزاد ہونے کی تدبیریں کر رہے تھے ان کو انگریز اور بعض انگریزوں کے ہاتھوں بکے ہوئے لوگ نقصان پہنچا رہے تھے۔ کبھی ذات پات کا مسئلہ کھڑا کر کے ہندوستانیوں کو منتشر کر دیتے تھے، کبھی فرقوں میں بانٹ کر نفرت کی دیوار کھڑی کر دیتے تھے۔ اقبال کو ہندوستانی قوم کا یہ رویہ اور عمل پسند نہیں آیا، لہذا انہوں نے تمام ذات، پات، اقوام، مذاہب اور علاقائی نفرتیں ہٹانے پر زور دیا۔ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا درس دیا اور ایک ہندوستانی قوم بن کر آگے بڑھنے کی تلقین کی۔ اقبال ایک وطن پرور اور وطن دوست انسان و شاعر تھے۔ ان کی نگاہِ بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ اگر ہندوستانی الگ الگ قوموں میں بٹ گئے تو ہندوستان کی نیا بھی ڈوب جائے گی اور ہندوستان بھی۔ لہذا انہوں نے نظمیہ شعری پیرائے میں اپنی قومِ ہند کو بیدار اور باخبر کرنے کی کوشش کی اور کہا:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال نے اس نظم کو موثر ترین بنانے کے لیے ترکیب بند کی ہیئت میں تخلیق کیا ہے۔ یہ نظم اگرچہ 8 بندوں پر مشتمل ہے لیکن ان آٹھ بندوں کے اندر آٹھ غزلوں کا آہنگ موجود ہے، اقبال کی نظموں کی یہ محبوب ہیئت ترکیب بند ہے، اسی ترکیب بند ہیئت میں انہوں نے اپنے ان خیالات کو ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چونکہ یہ نظم اقبال نے قریب 30 سال کی عمر میں لکھی ہے اس لئے اس میں عالم شباب کے جذبات اور رنگ موجود ہیں۔ لیکن یہ بھی حیرت ہوتی ہے کہ اس عمر میں ہمارا شاعر اتنا بلند بالغ النظر تھا کہ اس نے مستقبل کے فسادات کو اپنی نگاہ بصیرت سے بھانپ لیا اور اس کا سد باب کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس نظم میں کہیں کہیں خطابانہ اور راست لہجہ اپنایا گیا ہے، لیکن شعریات کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ تر اقبال نے استعارات و تشبیہات و تلمیحات، تعبیرات و تراکیب میں اپنی بات اور نظریات کو معتبر اور موثر بنایا ہے، بعض جگہوں پر علامات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ایسی چند تعبیرات و ترکیبات ذیل میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

"اٹھائے کچھ ورق لالے نے"، "کچھ نرگس نے"، "کچھ گل نے"، "قمریوں نے"، "طوطیوں نے"، "عندلیبوں نے"، "افسون جرس"، "زفیض دل طپیدہ"، "ریاض دہر" "گرد کدورت" "خزینہ ہوں"، "مشت خاک صحرا" "نہ صہبا ہوں"، "نہ ساقی ہوں"، "نہ مستی ہوں"، "عنادل باغ کے"، "آشیانوں میں"، "طائر بوستانوں میں"، "عہد کہن کی داستانوں میں"، "شمع دل"، "پروانہ ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو"، "شغل سینہ کاوی"، "صورت آئینہ حیراں"، "دل بستہ محفل"، "صفائے دل کو کیا"، "آرائش رنگ تعلق"، "کف آئینہ پر حنا باندھنا"، "شجر ہے فرقہ آرائی"، "تعصب ہے ثمر"، "محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی، جرس بھی کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے"، "علاج گردش چرخ کہن"، "شمع انجمن شیریں"، "بے ستوں"، "کوہکن"، "آدم"، "سکندر" یہ اور اس طرح کی کئی ایسی تراکیب اور تعبیرات و تلمیحات ہیں جن میں اقبال نے نہایت ہی ہنرمندی کے ساتھ اپنے خیالات ادبی اور شعری پیرائے میں شعریت کے ساتھ ڈھالے ہیں۔ اس طرح یہ نظم اپنے موضوع، ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے بانگ درا کی اہم نظم ہے۔

☆☆☆

UNIT II

غزلیات اقبال

تشریحات

غزل نمبر ایک

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بُت کدۂ صفات میں

حُور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیّلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں

گرچہ ہے میری جُستجو دَیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجُود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں

تُو نے یہ کیا غضب کِیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
مَیں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

شعر نمبر 1

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بُت کدہ صفات میں

فرہنگ:

نوائے شوق	:	عشق حقیقی میں ڈوبی ہوئی جذبوں سے پُر شاعری
حریمِ ذات	:	عرش اعظم، جہاں خدا تعالی کا استواء ہے
غلغلہ	:	ہنگامہ شور
الامان	:	خدا کی پناہ، پناہ
بت کدۂ صفات	:	کائنات، جس میں اہل بصیرت کو خدا کی مختلف صفتیں نظر آتی ہیں۔

تشریح :

غزل کے پہلے شعر میں اقبال محبوب حقیقی کی بارگاہ میں عرض گزار ہیں کہ اے ذاتِ مطلق، اے حسن مطلق، تیری ذات کا جلوہ مخلوق دیکھے یہ تو ممکن نہیں، لیکن ہاں جذبہ عشق میں بلند ہونے والی صدا سے ضرور حریم ذات میں ہنگامہ ہوسکتا ہے۔ اقبال اپنی شاعری کے حوالے سے یہ خصوصیت یہاں بیان کر رہے ہیں کہ میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات یعنی عرش معلیٰ پر ہنگامہ ضرور ہوا ہے اور اس قدر ہوا ہے کائنات میں جو تیری تخلیقیت سے تیری صفات ظاہر ہو رہی ہیں، یعنی موجودات اس ہنگامے سے خوفزدہ ہو کر اپنی حفاظت کی پناہ مانگ رہے ہیں۔

محاسن شعری :

اس شعر میں اقبال نے اپنی شاعری اور انسان کے جذبہ عشق کی بنا پر جو فریاد نکلتی ہے اسے ''نوائے شوق''، عرش اعظم کو ''حریم ذات''، موجودات کو ''بتکدہ صفات'' جیسے استعاروں میں کامیابی سے ڈھالا ہے۔

شعرنمبر:2

حُور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیّلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں

فرہنگ:

اسیر : قیدی
تخیلات : تخیل کی جمع، ذہن میں آئے ہوئے خیالات
خلل : رخنہ،فتور
تجلیات : تجلی کی جمع، خدا کے جلوے

تشریح :

اس شعر میں بھی شاعر محبوب حقیقی کے دربار میں عرض گزار ہے کہ میں تیری ذات کا عاشق ہوں تیری مخلوقات کا نہیں، حور و فرشتہ اگر دنیا میں مادی وجود نہیں رکھتے لیکن وہ میرے خیالات میں اسیر ہیں۔ وہ میرا مقصود منزل نہیں وہ تو مصنوع ہیں، مجھے تو صانع کی تلاش ہے یعنی اے محبوب حقیقی ان موجودات کی حقیقت تو میں جان چکا ہوں یہ میری نگاہ میں جچتے ہی نہیں ہیں۔ میری نگاہ تو تیری ذات میں خلل چاہتی ہے یعنی سنت الہیہ تو یہ ہے کہ ایک نظام کے ساتھ موجودات جاری وساری رہیں اور اس محبوب حقیقی کا جلوہ نہ دیکھ پائیں، لیکن اس نظام کے برعکس میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ نظام خلل پذیر ہو اور میں ذات کا جلوہ پاسکوں۔

محاسن شعری :

اس شعر میں بھی اقبال نے عشق کی شدید خواہش جلوہ محبوب حقیقی کو مختلف استعارات وتعبیرات کے دبیز پردوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شعر میں ''حور و فرشتہ''، "تخیلات''، ''نگاہ'' اور ''تجلیات'' کی تعبیرات میں جمالیاتی عناصر کو ہنرمندی سے ڈھالا ہے۔

شعرنمبر :3

گرچہ ہے میری جُستجو دَیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رَستخیز کعبہ و سومنات میں

فرہنگ:

جستجو : تلاش،تحقیق
دَیروحرم : مندراورکعبہ،کفراوراسلام،الگ الگ دین ومذہب
نقشبند : صورت گر،کسی شےکوشکل دینے والی
فغاں : فریاد،یہاں مراد ہےفکرانگیزشاعری
رَستخیز : قیامت،ہنگامہ
کعبہوسومنات : تمام اسلام وکفر کے حلقے

تشریح :

اس شعر میں دو لفظ خاص ہیں ''جستجو'' اور ''فغاں''، جستجو سے مراد عقل وفکر ہے اور فغاں سے مراد ذکر کا ثمر عشق ہے۔ اس شعر میں دیر وحرم اور مختلف مذاہب کے اختلافات کی وجوہ پیش کی ہیں، عقلوں کے نتائج سے جو کراہتیں پیدا ہوئی ہیں ان کو نشان زد کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے اے حقیقی محبوب، اگرچہ انسان نے تیری جستجو میں رنگارنگ طریقے اختیار کیے ہیں اور وہ طریقے ہیں دیر وحرم۔ یعنی کسی تیرے چاہنے والے نے تجھے دیر میں مقید کیا تو کسی چاہنے والے نے حرم میں، اپنے اپنے رویے اور سوچ وعقیدے کے مطابق ہر کسی نے نتیجہ نکالا ہے۔ اختلاف مکان کے سبب خیالات میں اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ حرم والوں کا کہنا ہے کہ تو دیر میں نہیں اور دیر والوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تو حرم میں نہیں ہے، دراصل یہ اختلافِ آرا عقل کا نتیجہ ہے۔ لیکن رہا عشق جس کو شاعر نے فغاں کہا ہے، جو ذکر کا نتیجہ ہے اس نے اس اختلاف کو مٹا دیا ہے۔ ان دونوں جگہ دیر وحرم میں ہنگامہ اور خلل پیدا کر دیا ہے، عشق نے حرم میں بھی تجھ کو پایا ہے اور دیر میں بھی عشق نے تیرے جلووں کا نظارہ کیا ہے۔

محاسن شعری :

یہاں ''جستجو'' اور ''فغاں'' جیسے کنایوں کے ساتھ ساتھ ''دیر و حرم'' ''کعبہ و سومنات'' جیسی علامتوں کے ذریعے اقبال نے معنی کا ایک جہان حسین پیرائے میں آباد کر دیا ہے۔

شعر نمبر :4

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجُود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں

فرہنگ:

گاہ : کبھی
دل وجود : کائنات کا باطن، اندرونی کیفیت، ہستی
توہمات : توہم کی جمع، وسوسے، شک، گمان

تشریح :

اس شعر میں اقبال نے سماج کی مختلف کیفیات کو پیش کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ انسان اپنی اصلیت یا سرشت کے اعتبار سے ایسا ناقص اور محدود تصور ہے کہ وہ محض اپنی عقل کی مدد سے کائناتی (موجودات) حقیقت دریافت نہیں کر سکتا، ہاں اس کے دل میں عشق ایسی طاقت ہے کہ اس کی مدد سے وہ حقیقت کی معرفت حاصل کر لے۔ اقبال کے نظریے کے مطابق انسان پر دو حالتیں طاری ہوتی ہیں کبھی تو اس کی نگاہ اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ وہ کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کی نگاہ وجود (شیں) کے آر پار ہو جاتی ہے اور کبھی وہ اپنے ہی پیدا کردہ وہم، شک یا گمان کے توہمات میں الجھ جاتا ہے اور حقیقت کی معرفت سے قاصر رہتا ہے۔

محاسن شعری :

اس شعر میں بھی دو تعبیریں ''دلِ وجود'' اور ''توہمات'' ایسی برتی گئی ہیں کہ جن میں معنی کا خزینہ موجود ہے۔ دل وجود سے استعارہ موجودات و مخلوقات کی حقیقت ہے اور توہمات سے استعارہ انسان کی اپنی بنائی ہوئی رسومات، تصورات اور وہم و گمان ہیں، جن میں انسان اصل حقیقت سے ہٹ کر انہیں کو سب کچھ تصور کرتا رہتا ہے۔ غزل نام ہی اس صنف کا ہے جس میں شاعر اختصار اور مبہم لفظیات میں حسین پیرائہ اظہار خلق کرے۔ اس میں اقبال کامیاب ہیں۔

شعرنمبر :5

تُو نے یہ کیا غضب کِیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
مَیں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں!

فرہنگ:

فاش کرنا : ظاہر کرنا
الجھ کے رہ جانا : اٹک کر یا پھنس کر رہ جانا
سینہ کائنات : کائنات کا سینہ

تشریح :

اس شعر کا مفہوم تو بہت وسیع ہے لیکن یہاں مختصراً پیش ہے کہ اقبال اور صوفیا کے نظریہ کے مطابق انسان خدا کا راز ہے، اس کا بھید ہے، خالق حقیقی کا شاہکار ہے انسان، فلاسفہ نہ ہو تو اس کو صرف جسم کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی صرف روح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انسان کے باطن میں ایک جوہر ہے اور وہ ہے 'انا' لیکن یہ انا (خودی) مقید ہے اور محبوب حقیقی کی انا مطلق ہے لہذا اس مقید انا کا ایک خاص تعلق انائے مطلق سے ہے، یہی وہ راز ہے جس راز سے متعلق اقبال خدا کی بارگاہ میں شوخیانہ لہجے میں استعجابی سُر بلند کر رہے ہیں۔ دراصل یہ لہجہ مالکِ حقیقی یا محبوبِ حقیقی کی بارگاہ کے شایان شان نہیں ہے مگر شاعر اس کو بے تکلفانہ انداز دے کر خاص معنی اور کیفیت کو قارئین تک پہنچانا چاہتا ہے اس لئے شعر کی شریعت میں اسیروا رکھا گیا ہے۔

شعری محاسن :

اس شعر میں شوخی کے ساتھ ساتھ بے تکلفی کا حسن نظر آتا ہے اور جس طرح اقبال نے محبوب حقیقی کی جناب میں کلام کیا ہے اس کو شعری اصطلاح میں مراعات شاعرانہ کہا جاتا ہے۔

غزل نمبر دو

اگر کج رو ہیں انجم، آساں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس ہے یارب! لا مکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبح ازل انکار کی جرات ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا؟ وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمد بھی ترا، جبرئیل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

تشریح

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

شرح :اس شعر میں اقبال اللہ تعالی سے مخاطب ہیں ۔وہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ستارے ٹیڑھے اور کج رو ہیں ۔ یہاں انجم سے مراد بنی نو آدم سے ہے ۔یعنی دنیا کے بیشتر لوگ تیری مرضی پر نہیں چلتے ۔وہ صراط مستقیم پر چلنے کے بجائے غلط راستے پر گامزن ہیں ۔آخر ایسا کیوں ہے کہ جھوٹے اور مکار لوگوں کا بول بالا ہے اور ایماندار اور صحیح راستے پر چلنے والے لوگوں کو اس دنیا میں قدر و منزلت میسر نہیں ہے ۔ یہ دنیا تمہاری تخلیق کردہ ہے اس لیے مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔اس جہان کو پیدا کرنے والا میں نہیں بلکہ یہ جہاں تیرا پیدا کردہ ہے اس

لیے تیری مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ اقبال نے بے باکانہ انداز میں اللہ تعالی سے سوال کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ وہ مشیت ایزدی پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ حقائق کائنات کی مرضی پر اپنا سر خم کر دیتے ہیں۔

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس ہے یارب! لا مکاں تیرا ہے یا میرا؟

شرح :اقبال کہتے ہیں کہ اے خدا لامکاں میں اگر تیرے فرشتے ہنگامہ ہائے شوق پر پا نہیں کرتے تو اس میں بھی تیری وحکمت پوشیدہ ہے۔ تو نے فرشتوں کے اندر مشق کا وہ جذبہ پیدا نہیں کیا جو انسان کے دل میں پیدا کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے یہ انسان اس عالم میں تیری محبت میں ہنگامہ ہائے شوق بر پا کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے اس دنیا میں دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ دراصل اقبال نے اس شعر میں فرشتوں پر انسان کی فضیلت کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

اسے صبح ازل انکار کی جرات ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا؟ وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

شرح :اے خدا ابلیس نے تیرے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن اس میں انکار کی جرات کیوں کر پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی راز پوشیدہ ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کا راز داں ہے۔ دراصل تیری مرضی بھی یہی تھی کہ دنیا میں آدم کے ساتھ ساتھ ابلیس کا وجود بھی کارفرما رہے اس لیے تو نے دونوں کو پیدا کیا۔ تو اگر چاہتا تو اسے انکار کرنے کی ہمت ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ بہر حال میں مصلحت خداوندی کے آگے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

محمد بھی ترا، جبرئیل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

شرح :اقبال کہتے ہیں کہ اے اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل اور قرآن حکیم سب تیرے ترجمان ہیں اور اہل دنیا پر تیری مرضی کے مطابق ترجمانی کرتے ہیں لیکن ایک بھی حرف شیریں یعنی یہ جذبہ عشق ومحبت جو انسان کے قلب میں موجزن ہے۔ یہ بھی تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔ میکس کا ترجمان ہے۔ یعنی انسان کی ہستی کا ثبوت یہ جذبہ عشق ہے۔ یہی وہ عشق کا جذبہ ہے کہ انسان آتش نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

شرح :اے خدا تیری ہی دنیا آدم ہی کے دم سے نہ صرف آباد ہے بلکہ اس کی وجہ سے اس میں خوب صورتی اور رونق ہے۔اگر جذبہ عشق ختم ہو جائے تو آدم ختم ہو جائے گا اور زوال آدم خاکی میرا زیاں نہیں ہے بلکہ اس میں آپ کا ہی نقصان ہے۔اقبال اس شعر میں بھی اللہ سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا تیری دنیا اسی کوکب کی تابانی سے روشن ہے۔اگر عشق کا جذب ختم ہو جائے تو یہ دنیا تاریک ہو جائے گی اور زوال آدم خاکی سے آدم کا نقصان نہیں بلکہ تیرا ہی نقصان ہو گا اور سید نیا ویران ہو جائے گی یعنی جذبہ عشق سے خالی ہو جائے گی۔

غزل نمبر تین کی تشریح

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش!
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مُدّت سے خموش

مَیں نے پایا ہے اُسے اشکِ سحر گاہی میں
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش

نئی تہذیب تکلّف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگُونہ فروش!

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

شعرنمبر:1

کھونہ جا اس سحر وشام میں اے صاحب ہوش!
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

فرہنگ:

سحروشام	:	صبح وشام، مراد وقت کی گردش
صاحب ہوش	:	دانا شخص
فردا	:	آنے والا کل
دوش	:	گزرا ہوا کل

تشریح :

علامہ اقبال نے زمان ومکان کا تصور پیش کیا ہے کہ زمانہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک زمانہ مسلسل دوسرا زمانہ حقیقی۔زمانہ مسلسل رات، دن، صبح وشام، ہفتہ اور ماہ وسال میں تقسیم ہوتا ہے جبکہ زمانہ حقیقی ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم نہیں ہوتا بلکہ زمانہ حقیقی میں ہمیشہ حال ہی ہوتا ہے۔زمانہ مسلسل جسے ہم اور آپ ماضی، حال، مستقبل، دن، رات ماہ اور سال میں تقسیم کرتے ہیں اس میں پائے جانے والے موجودات کو فنا ہے لیکن جس شے کا تعلق زمانے سے آگے نکل کر ماورا ہو کر زمانہ حقیقی سے تعلق ہو جائے وہ کبھی فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کی زندگی ہمیشہ رہتی ہے۔اس تمہید کے بعد اقبال کا اس شعر میں کہنا ہے کہ اے صاحب ہوش انسان تو صرف دکھنے والی گردش وقت یعنی شام وصبح ماہ وسال میں گم ہو کر نہ رہ جا بلکہ اس زمانے سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر کہ جس میں نہ گزرا ہوا کل ہے نہ آنے والا کل، کیونکہ اگر تو نے اس جہاں سے تعلق جوڑ لیا جہاں محبوب حقیقی کی ذات ہے تو تجھے کبھی فنا نہ ہو گی اور تیری زندگی کو ہمیشگی نصیب ہو جائے گی۔تو مایوس نہ ہو، امید کے ساتھ آگے بڑھ اور اس چمکتی اور سنہری دنیا کے جھمیلوں میں نہ کھو جا محبوب حقیقی سے تعلق جوڑ۔

شعری محاسن :

اس شعر میں شاعر نے سحر وشام سے استعارہ کیا ہے، گردش وقت اور موجودات ومخلوقات سے ''صاحب ہوش'' کنایہ ہے اہل نظر سے ''جہاں'' سے زمانہ حقیقی اور محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ کو تعبیر کیا ہے۔''فردا نہ دوش'' سے ماضی اور مستقبل

مراد لیا ہے یعنی ناپائیدار موجودات۔ اس طرح شاعر نے شعریت کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے تصور اور خیال کا حسین پیراہ میں اظہار کیا ہے۔

شعر نمبر :2

کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مُدّت سے خموش

فرہنگ:

ہنگامہ فردا	:	مستقبل کا ہنگامہ
مسجد	:	مذہبی عبادت گاہ
مکتب	:	مدرسہ، مراد مذہبی ادارے، تربیت گاہ
میخانہ	:	شراب خانہ، مراد شرابِ عشق کا ادارہ، خانقاہ

تشریح :

اس شعر میں اقبال کا کہنا ہے کہ مسجد، مدرسے، تربیت گاہیں اور خانقاہیں، سب اپنے منصب اور ذمہ داری کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ مدرسے اور خانقاہوں میں عشقِ محبوبِ حقیقی یا معرفت کی شراب پلائی جاتی ہے اور عبادت گاہوں میں مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کیا جاتا ہے، عملی طور پر انسانیت کی مساوات کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن مدت سے یہ سب خاموش ہیں یعنی اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ادارے اپنے مقصدِ وجود کو بھول بیٹھے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس ملت کا مستقبل کیا ہوگا۔

شعری محاسن :

اس شعر میں شاعر نے ''مسجد و مکتب'' کو علامت کے طور پر اور ''میخانے'' کو استعارتاً برتا ہے اور ''فردا'' کو مستقبل کی ناکامی یا کامیابی کے لئے استعمال کر کے شعریت کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔

شعر نمبر:3

مَیں نے پایا ہے اُسے اشکِ سحر گاہی میں
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش

فرہنگ:

عشق سحر گاہی	:	مراد رات کے پچھلے پہر محبوب حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہو کر گڑگڑانا
اسے	:	مراد محبوب حقیقی یا حقیقت حسن مطلق
دُرِناب	:	خالص موتی
صدف	:	سیپی

تشریح :

رات کے پچھلے پہر جب بندہ اپنے محبوب حقیقی کی جناب میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے اور آنسوؤں کی بارش سے اپنی ندامت کا اظہار کرتا ہے تو وہ ندامت میں بہائے ہوئے آنسو موتیوں سے قیمت میں بڑھ جاتے ہیں بلکہ یہ آنسو کے ایسے موتی ہوتے ہیں، موتی کی سیپی کے احسان سے آزاد ہوتے ہیں۔اس لئے اقبال نے رات کے پچھلے پہر محبوب حقیقی کی بارگاہ میں اشک فشانی کر کے اپنے محبوب حقیقی کو خود پر راضی کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان آنسوؤں کی قیمت اس قدر انمول ہو جاتی ہے کہ موتی بھی اس کی عظمت کو نہیں پہنچ پاتے اور یہ آنسوؤں کے موتی صدف یعنی سیپی کے بارِاحسان سے آزاد رہتے ہیں۔

شعرنمبر :4

نئی تہذیب تکلّف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گُلگُونہ فروش!

فرہنگ:

چہرہ روشن ہونا	:	مراد اندر یا باطن روشن ہونا
گلگونہ فروش	:	سرخی پاؤڈر بیچنے والا، غازہ
نئی تہذیب	:	مغربی تہذیب
تکلف	:	بناوٹ، کھوکھلا، دکھلاوا

تشریح :

اس شعر کا مفہوم قدرِ واضح ہے کہ مغربی تہذیب سراسر بناوٹ اور تصنع ہے لیکن جس بنی نوع آدم کا چہرہ ایمان

کے نور سے روشن ہو تو اسے غازہ کریم پاؤڈر اور گلگونہ کی کیا ضرورت ہے۔

شعر نمبر:5

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے **سروش**

فرہنگ:

صاحب ساز : ساز والا، مراد اہل نظر
گاہے گاہے : کبھی کبھی
غلط آہنگ : غلط سُر، غلط لَے، غلط منہاج
سروش : فرشتہ، مراد الہام یا **کشف**

تشریح :

اقبال نے اس شعر میں تصوف کی راہ میں بھٹکنے کے امکان کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو محبوب حقیقی کا کامل بندہ ہوتا ہے یعنی نبی اسے الہام یا وحی کے سمجھنے میں غلطی صادر نہیں ہوتی لیکن وہ بندہ جو کامل نہ ہو جیسی صوفی سالک، ولی یا صاحب کشف کبھی اپنے کشف یا الہام کی تعبیر میں غلطی کا شکار بھی ہو سکتا ہے، اسی لئے یہ اصول ہے کہ اولیا کا کشف و الہام حجت شرعی نہیں ہے۔ اقبال نے راہ طریقت کے سالک کو باخبر کیا ہے کہ کشف و الہام کی تاویل میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، اس میں استدراج شیطانی کا رنگ بھی آسکتا ہے کیونکہ بہت سے الہام محبوب حقیقی کی طرف سے آتے ہیں اور بہت سے الہام شیطان کی طرف سے، تو صاحب ساز، یعنی سالک ضروری نہیں کہ جو ساز (الہام) ہوا ہے وہ محبوب حقیقی کی طرف سے ہی ہو بلکہ وہ غلط آہنگ یعنی الہام، استدراج بھی ہو سکتا ہے یعنی شیطانی طاقت کی طرف سے تجھے برباد کرنے کے لیے آسکتا ہے لہذا اس راہ سلوک میں باخبر رہ تا کہ کہیں اپنے وہم و گمان میں آ کر برباد نہ ہو جائے۔

شعری محاسن :

اس شعر میں بھی اقبال ''صاحب ساز''، ''غلط آہنگ'' اور ''سروش'' کی تراکیب کو استعاراتی اور کنائی پیرائے میں برت کر شعر کے حسن کو صرف بچایا ہی نہیں بلکہ اس کے حسن کو دو چند کر دیا ہے۔

غزل نمبر چار کی تشریح

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی، زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بُو پر
چمن اور بھی،آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا مَیں، انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

شعرنمبر:1

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

فرہنگ :

ستارہ	:	مراد ہے بلند مقام
جہاں	:	مراد ہے اس رنگ و بو کے علاوہ دوسری زندگی جو ہمیشہ رہے گی
عشق کے امتحاں	:	محنت ومشقت کی منزلیں یا مرحلے

تشریح :

یہ غزل مسلسل ہے یعنی اس میں ایک بنیادی خیال ہے جس کو اقبال نے مختلف پیرا ئہ اظہار میں بیان کیا ہے۔ اس غزل میں اس تصور کو پیش کیا گیا ہے کہ انسان کی زندگی صرف اس دنیاوی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ انسان کے لئے اس کے علاوہ بھی جہان موجود ہے، جہاں زندگی کی ترقی ہی ہوتی رہی ہے، اس شعر میں اقبال نے ایک رجائی کیفیت پیدا کرتے ہوئے مخاطب کو یہ پیغام دیا ہے کہ اگر تو ایک میدانِ ہستی میں کامیاب نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں دوسری جہت کی طرف بڑھ، وہاں سے تم کامیاب ہو سکتے ہو، لیکن ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں بلکہ جگر کاوی اور محنت و مشقت کے ساتھ آگے بڑھو بہت سارے ایسے مقام آئیں گے جہاں تمہیں تلخ آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑے گا کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

شعری محاسن :

اقبال نے اس دنیا کا استعارہ ''ستاروں'' سے کیا ہے، آخرت کی دنیا کو یا اگلی کامیابی کی منزل کو ''جہاں'' اور محنت ومشقت یا جدوجہد کا استعارہ ''عشق کے امتحاں'' کی تعبیر سے کیا ہے۔ اس طرح ایک راست خیال اور پیغام کو شعریت کے حسن کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

شعرنمبر:2

تہی، زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی **ہیں**

فرہنگ :

تہی : خالی، زندگی سے خالی

یہ فضائیں : مراد کائنات، دنیا، موجودات

کارواں : **قافلہ**

تشریح:

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ کائنات، یہ دنیا ایسی نہیں ہے کہ زندگی سے خالی ہے، اے انسان یہاں صرف تو ایک زندگی نہیں گزار رہا ہے، تُو تو اشرف المخلوقات کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے اس کے باوجود شکوہ بہ لب ہے، تیرے علاوہ کئی ہزار عالم ہیں اس جہان میں سینکڑوں زندگی کے قافلے ہیں جو تیرے ماتحت زندگی گزار رہے ہیں اور وہ خوش ہیں، تو صرف ایک جہان کو دیکھ کر مایوس ہوگیا، رجائیت کے ساتھ آگے بڑھ، تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں۔

شعری محاسن:

اس شعر کا حسن یہ ہے کہ اس دنیا اور زندگی کے نشیب وفراز اور سخت وگرم کو ''فضاؤں'' سے تعبیر کیا ہے اور انسان کے علاوہ اٹھارہ ہزار کم وبیش عالموں کی زندگی کو ''سینکڑوں کارواں'' کی تعبیر میں ڈھال کر معانی کا ایک جہان آباد کر دیا ہے۔

شعرنمبر:3

قناعت نہ کر عالم رنگ و بُو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی **ہیں**

فرہنگ:

قناعت کرنا : تھوڑے کو کافی سمجھنا اور اس پر صبر و شکر ادا کرنا

عالم رنگ و بو : مراد دنیا، کائنات، موجودات

چمن : مراد جہان

آشیاں : مراد مقام

تشریح:

اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے انسان تو صرف اس ظاہری دنیا پر قناعت نہ کر، چپ ہو کے نہ بیٹھ جا، بلکہ انسان کے لئے اس کے علاوہ بھی ایسا جہان آخرت ہے جہاں اس کی زندگی کو ہمیشگی ہے اور اس کے اعمال کے مطابق اس کے بلند مقامات ہیں۔ یعنی خدا کے بندے کی زندگی سکونی نہیں بلکہ حرّ کی ہے، ہمیشہ جدو جہد اور تگ و دو میں رہنا ہی اس کی خصوصیت ہے۔

شعری محاسن:

اقبال نے حسنِ خیال کیا عتبار سے وہ معانی پیدا کیے ہیں جو اوپر والے اشعار میں گزرے ہیں لیکن پیرایہ اظہار کو رنگا رنگی دی ہے کہ اس دنیا کو ''عالم رنگ و بو'' سے معنی آفریں تعبیر میں پیش کیا ہے، جہان آخرت کو ''چمن'' سے اور جنت و نعمت کے مقامات کو ''آشیاں'' سے تعبیر کر کے شعری جمالیات کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔

شعر نمبر:4

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

فرہنگ:

نشیمن : گھونسلا، مراد منزل

مقامات آہ و فغاں : مراد جدو جہد کے موقعے

تشریح:

اس شعر میں بھی اقبال نے انسان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے انسانی کیفیات و جذبات اور شعور سرگرم عمل

رکھنے کے لیے ایک الگ اسلوب میں وہی خیال دہرایا ہے جو ما قبل کے اشعار میں گزرا ہے۔اقبال نے مخاطب کو یہ کہا ہے کہ اگر تو نے محنت ومشقت کی ہے اس کے باوجود تجھے تیری منزل یا مقام اور مقصد حاصل نہیں ہوا ہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔اگر ایک نشیمن (منزل) کھو گیا ہے تو کوئی بات نہیں اس کے سبب تو تھک ہار کر بیٹھ مت جا بلکہ تو کسی دوسرے مقام ومرتبے کے لیے جدوجہد کر، یا دوبارہ پھر سے کوشش کر، کیونکہ تھک ہار کر مایوس ہو جانا تو تجھے بالکل ہی صفحۂ مقام سے مٹا ڈالے گا۔پھر سے تازہ دم ہو کر جگر کاوی سے کام لے،منزل تیرے قدموں میں **ہوگی**۔

شعری محاسن:

اس شعر میں ایک منزل یا مقصد کو ''نشیمن'' سے تعبیر کیا ہے اور دوبارہ کی جدوجہد کو ''مقاماتِ آہ وفغاں'' سے تعبیر کر کے غزلیہ شعر کے تقاضہ اختصار کو پورا کرتے ہوئے شعری حسن کو برقرار رکھا ہے۔

شعر نمبر:5

تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی **ہیں**

تشریح:

اس شعر میں اقبال نے اپنی محبوب علامت ''شاہین'' برت کر انسان کو ایک امید دلائی ہے، کہ تُو، تو شاہین ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے گھونسلے نہیں بناتا، وہ اونچی سے اونچی پہاڑی کی طرف پرواز کرتا ہے، وہ کسی کی دنیا نہیں مانگتا، وہ اپنی دنیا آپ بناتا ہے، وہ دوسرے کے کیے ہوئے شکار پر نہیں گرتا وہ اپنا شکار خود کرتا ہے، لہٰذا اے مردِ مومن تیرے اندر تو شاہین کی صفت موجود ہے تو ایک منزل پر پہنچ کر کیوں اسے آخری منزل سمجھ بیٹھا ہے بلکہ ہر آنے والی منزل کو تو اپنے لئے تھوڑے عرصے کے لیے ایک پڑاؤ سمجھ، تیری صلاحیت تو سات آسمانوں سے پار جانے کی ہے، یہی ایک آسماں تیرا نہیں فلک الافلاک بھی تیرا ہی ہے، ''تیرے سامنے آسماں'' یعنی مقامات ومنازل اور بھی **ہیں**۔

شعری محاسن:

اس شعر میں اقبال نے علامتی پیرایہ اختیار کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز اور محبوب علامت ''شاہین'' کو مرکز بنا کر معانی کو اس قدر پھیلایا ہے کہ قاری کے اندر ایک حوصلہ اور خود اعتمادی کا وصف پیدا ہونے لگتا ہے، حسنِ خیال کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان کا پیدا کرنا یہ علامہ اقبال کا انفراد ہے۔

شعر نمبر:6

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

فرہنگ:

روز وشب : مراد وقت کی گردش
الجھ کر رہ جانا : پھنس کر رہ جانا
زمان ومکاں : زمانہ اور مقام، وقت اور دنیا

تشریح:

غزل نمبر تین کا پہلا شعر یاد رکھیں کہ اس میں بھی یہی معنی اقبال نے بیان کیے ہیں کہ ''کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش!'' اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش'' انہوں نے اس شعر میں بھی یہی بات دہرائی ہے زمان مسلسل یعنی جو رات اور دن میں تقسیم ہو جانے والا جہان ہے دنیا اسی میں مت الج کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں یہ تو ناپائیدار ہے کہ اس زمان سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کر جس میں نہ فردا ہے نہ دوش، جس میں نہ ماضی ہے نہ مستقبل بلکہ حال ہی حال ہے، روشنی ہی روشنی، جس کو موت نہیں، فنا نہیں تیری زندگی کا مقصد اس مقام تک پہنچنا ہے اس روز و شب میں الجھنا نہیں ہے۔

شعری محاسن:

اس شعر میں بھی اقبال نے اپنا فلسفہ خاص نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دیا ہے، دنیا کی ناپائیداری بھی اور ہمیشہ رہنے والا مقام زمانہ خالص بھی۔ اور بڑے مفہوم گو ''روز و شب'' اور ''زمان و مکاں'' کی دو ترکیب میں اس طرح

رکھ دیا ہے کہ اقبال کی غزل کی معنویت پر ایمان لانے کو جی کرتا ہے"

شعر نمبر: 7

گئے دن کہ تنہا تھا مَیں انجمن میں
یہاں اب مِرے رازداں اور **بھی ہیں**

فرہنگ:

انجمن : محفل، مراد قوم وملت

رازداں : بھید جاننے والا، مراد شاعری کے اصل مقصد کو پا جانے **والا**

تشریح :

اقبال اس شعر میں اپنی محنت کا ثمر پیش کر رہے ہیں کہ ایک دن تھا کہ جس مقصد اور پیغام کو میں لے کے چلا تھا، اس وقت میں تنہا تھا کہ میں مسلسل قوم وملت کو اس کے اصلی مقصد، منزل اور نصب العین کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ اس کے رموز و اسرار سے پردہ اٹھاتا رہا۔ اب مجھے امید ہے کہ میری قوم وملت کو اپنے نصب العین اور مقصد کی معرفت ہو چکی ہے اور وہ جہدِ عمل کے لیے نکل پڑی ہے، اب میں تنہا نہیں جو انسانیت کی عظمت کا خواہاں ہو بلکہ ایک انجمن یعنی قوم میرے ساتھ کھڑی ہے، میرے راز و مقصد وہ بھی سمجھ چکے **ہیں**۔

شعری محاسن:

اس شعر کا حسن یہ ہے کہ اقبال نے اپنے تمام تصورات کی جانب اس شعر میں اجمالی ذکر کر دیا ہے اور ان تصورات وخیالات اور پیغام کو انجمن اور "رازداں" کی تعبیرات میں سمیٹ لیا ہے۔ یہ کام صرف اور صرف ایک ہنر مند فن کار ہی کر سکتا ہے۔

یہ غزل مسلسل ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس اصول کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تصورِ حیات سکونی اور منجمد نہیں بلکہ حرکی اور مسلسل بہاؤ کا نام ہے، اس لیے چھوٹی چھوٹی ناکامیوں سے مایوس ہو کر بیٹھ جانا، تھک ہار کر اپنے بڑے مقصد اور نصب العین کو فراموش کر دینا مردِ مومن کا شیوہ نہیں۔

غزل نمبر ۵

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارہ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہوگا
سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے رومائی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے، خوار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا!
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہوگا
سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا
جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت سے تیری تو پھر کے اعتبار ہوگا؟
کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا گل ہیں!
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ راز دار ہوگا!
خدا کے عاشق تو ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
یہ رسم بزم فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کا
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا
نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا
نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں راہگذار بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا!

تشریح

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

شرح :اقبال کہتے ہیں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے دین و اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو عام کرے تا کہ دنیا اس کے نور سے منور ہو سکے۔کیوں کہ یورپ کا مادہ پرستانہ نظام حیات باطل ہو چکا ہے۔اس لیے اسلام کے فروغ کا یہ بہت اچھا دور ہے۔اسلام کے حقائق اب تک پردوں میں پوشیدہ تھے۔لہذا اب سکوت توڑنے کا وقت آگیا ہے اور اسلامی حقائق کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

شرح :وہ دور گزر گیا کہ جب مسلمان چھپ کر حجروں میں اسلامی درس دیا کرتے تھے۔لیکن اب اعلامیہ اسلامی حقائق کو بیان کریں گے اور سارا جہاں اسلامی اصولوں سے روشناس کر دیں گے۔

کبھی جو آوارہ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیاز خارزار ہوگا

شرح : عشق کی دیوانگی میں گھومنے والے صوفی جن کے اندر تبلیغ اسلام کی تڑپ تھی، وہ بیزار ہو کر گوشہ گمنامی میں چلے گئے، ایک بار پھر وہ بستیوں میں آجائیں گے۔ان کی برہنہ پائی یعنی جدو جہد کا عالم تو تقریبا ہی رہے گا لیکن جدو جہد کا مقام بدل جائے گا طریقہ بدل جائے گا۔

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

شرح : حجاز کی خامشی سے مراد اسلام کی زبان حال ہے یعنی ایسے آثار نظر آرہے ہیں کہ پھر سے رحمت الہی کا نزول ہوگا اور جو وعدہ صحرائیوں یعنی عربوں سے کیا گیا تھا وہ پھر استوار ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ عربوں پر جس طرح

رحمت کی بارش ہوئی تھی اسی طرح ملت اسلامیہ پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ہوگی۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

شرح :اقبال کہتے ہیں کہ میں نے فرشتوں سے سُنا ہے کہ وہ شیر یعنی مسلمان قوم پھر سے ہوشیار ہونے والی ہے ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عرب سے نکل کر مسلمان قوم نے روم کی سلطنت کو الٹ دیا تھا، وہ قوم پھر بہت جلد بیدار ہونے والی ہے۔

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیر میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے، خوار ہوگا

شرح : قوم کے لیڈر نے قومی کارکنوں کی انجمن میں میرا تذکرہ کیا کہ اقبال بھی قوم کی خدمت کے لیے تیار ہے۔تو پیر میخانہ بزرگان ملت یہ سن کر کہنے لگے کہ اقبال منہ پھٹ ہے یعنی سچ بولتا ہے۔اس لیے وہ اپنوں اور عزیزوں کی نظر میں ذلیل وخوار ہوگا۔

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا!

شرح :اے مغرب کے رہنے والو یہ دنیا بہر حال دنیا ہے۔ یہ دکان یا تجارتی ادارہ نہیں ہے جس پر تمہارا قبضہ ہو سکے۔جس تہذیب ومعاشرت کو دنیا کے حق میں مفید سمجھ رہے ہو وہ بہت جلد ناکام ہونے والی ہے۔ یہ تہذیب کھوٹے سکے کی طرح ہے۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپایدار ہوگا

شرح : مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری تہذیب جس پر تمھیں ناز ہے عنقریب دم توڑنے والی ہے۔کیوں کہ اس کی بنیاد کمزور ہے۔جس طرح کمزور شاخ پر بنا ہوا آشیانہ پائیدار نہیں ہوتا۔کمزور شاخ زیادہ بوجھ برداشت نہیں کرتی ،لہذا شاخ کے ساتھ آشیانہ بھی برباد ہو جاتا ہے۔یہی صورت حال تمہاری تہذیب کی ہے جس کی بنیاد تحکم نہیں ہے۔

سفینہ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

شرح : مورناتواں سے مراد مسلمان قوم ہے یعنی جدو جہد کرنے والا انسان ۔مسلمان قوم جو چیونٹی کی مانند کمزور ہے وہ گلاب کی پتی کی کشتی بنائے گی اور تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنی کشتی کو دریا سے پار کرے گا۔یعنی موجوں کے تھپیڑوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی مسلمان قوم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

شرح : جس طرح باغ میں پھول اپنے عشق کے زخم سب کو یہ مجھ کر دکھاتا ہے کہ اس کا نام ناکام عاشق میں ہوگا ٹھیک اسی طرح آج کل یہ حالت ہے کہ قوم کے واعظ اپنا وقار قائم کرنے کے لیے لوگوں کو قوم پروری کے جذبات سے آشنا کرتے ہیں اور یہ مجھتے ہیں کہ اس طرح زبانی جمع خرچ سے قوم کے خادموں میں شمار ہوگا۔اس طرح اقبال صرف گفتار کے نہیں بلکہ کردار کے قائل ہیں۔

جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کے اعتبار ہوگا؟

شرح : دین اسلام ایک تھا لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اسے مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو پھر اس پر کون اعتبار کرے گا۔جن میں آپس میں اتفاق رائے نہ ہو وہ دوسروں کو کس طرح قائل کر سکتے ہیں۔لہذا اقبال متحد ہونے کی تلقین کرتے ہوئے ایک ہی دین اسلام پر قائم رہنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا گل ہیں!
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ راز دار ہوگا!

شرح : ایک دن میں نے قوم کے ایک ہمدرد سے یہ کہا کہ جو لوگ خود کو آزاد کہتے ہیں وہ بھی حکومت کے غلام ہیں۔ یہ سن کر میری قوم کے نیچے یعنی نوجوان کہنے لگے کہ اقبال نے یہ بڑے پتے کی بات کہی ہے کیوں کہ وہ حکومت کے رازوں سے واقف ہے اس لیے اس بات میں وزن ہے۔

خدا کے عاشق تو ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

شرح :اس دنیا میں خدا کے عاشق بے شمار ہیں لیکن خدا کا اصل عاشق وہ ہے جو خدا کے بندوں سے پیار کرتا ہے،ان سے ہمدردی کرتا ہے اور انہیں راہ راست پر لاتا ہے۔

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبش نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

شرح : قوم کی خدمت پھولوں کی سیج نہیں ہے۔اس راہ میں بے شمار دشواریاں ہیں لہذا گھبرا کر اُف کرنا یعنی جنبش نظر بھی گناہ ہے۔اگر بے قراری کا اظہار کرے گا تو پھر اس کی قوم میں کوئی عزت نہیں رہے گی۔

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کا
شرر فشاں ہوگی آہ میری ،نفس مرا شعلہ بار ہوگا

شرح :اقبال کہتے ہیں ظلمت شب یعنی مشکلات راستے میں حائل ہونے کے باوجود میں اپنی قوم کو بیدار کروں گا۔اس مقصد کے لیے اپنی قوم کے اندر عشق رسول کی آگ بھڑکاؤں گا۔پر درد شاعری سے ان کی رگوں میں خوں دوڑاوں گا۔میری آہ یعنی شاعری انگارے برسائے گی اور میری سانس سے شعلے نکلیں گے۔

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

شرح :اگر تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہوگا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔اگر تمہارا مقصد صرف ہیں ہے کہ کچھ عرصہ زندہ رہ کر مر جاتا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔تمھاری مثال اس چنگاری کی طرح ہے جو روشنی بکھیرتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔علامہ اقبال قوم سے مخاطب ہیں۔

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سر راہگذار بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا!

شرح :اقبال مقطع میں کہتے ہیں کہ ابھی بھی میں انہیں کیفیات سے دو چار ہوں۔جس طرح راستے میں دکھ اٹھانے والا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ستم کش انتظار یعنی انتظار یار کی زحمت اٹھاتا رہوں گا۔

غزل نمبر ۶

افلاک ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر
احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز وتب و تاب اول، سوزو تب وتاب آخر!
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر!
میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول، دیتے ہیں شراب آخر!
کیا دبدبہ نادر، کیا شوکت تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرق کے ناب آخر!
خلوت کی گھڑی گزری، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو بجلی ہے آغوش سحاب آخر!
تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر!

تشریح

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر ، اٹھتے ہیں حجاب آخر

شرح :اس شعر میں اقبال نے راہ خدا میں زندگی گزارنے والے لوگوں کو خوشخبری دی ہے کہ شروع میں کچھ دشواریاں ضرور ہوتی ہیں لیکن اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ۔کیوں کہ اللہ ان لوگوں پر فضل و کرم کی بارش کرتا ہے اور آخر میں ان کے کارناموں کا جواب آسمان سے آتا ہے اور آہستہ آہستہ حجاب بھی اٹھ جاتے ہیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

احوال محبت میں کچھ فرق نہیں آیسا
سوز و تب و تاب اول، سوز و تب و تاب آخر!

شرح : محبت کے احوال میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا ہے ۔ بظاہر محبت میں آدمی مختلف کیفیات سے دو چار ہوتا ہے اور احوال میں بھی فرق نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بنیادی فرق نہیں ہوتا ہے ۔یعنی سوز وتب و تاب کی جو کیفیت شروع میں رہتی ہے کم وبیش وہی کیفیت آخر میں بھی رہتی ہے ۔ دراصل سوز وتب وتاب اور تڑپ ہی محبت کا خاصا ہے ۔اس لیے اقبال اس پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اول ، طاؤس و رباب آخر!

شرح : تقدیر امم یعنی قوم کی تقدیر کا راز شمشیر وسناں میں پوشیدہ ہے ۔یعنی جفاکشی اور محنت سے حکومت حاصل ہوتی ہے اور حکومت کے نشہ میں طاؤس و رباب کے ذریعے عیش وعشرت میں قوم مشغول ہو جاتی ہے اور یہی اس کے زوال کا باعث بنتی ہے یعنی اس شعر میں اقبال نے قوموں کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے ۔

میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول، دیتے ہیں شراب آخر!

شرح :اقبال کہتے ہیں کہ یورپ کے کام کرنے کا انداز بالکل الگ ہے۔وہ بہت ہی طریقے سے ایشائی قوم کو اپنا غلام بنالیتی ہے۔ پہلے وہ دوستی کے ذریعے اپنی چیز میں فراہم کرتے ہیں۔انھیں عادی بنا دیتے ہیں۔اتنی سہولیات فراہم کرتے ہیں کہ اس قوم کو شروع میں سرور آنے لگتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ انھیں شراب آخر یعنی غلام بنالیتا ہے۔یعنی یورپ کے دستور برائے ہیں۔وہ بہت ہی خوب صورتی سے ایشائی قوم کو اپنا غلام بناتی ہے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا۔

کیا دبدبہ نادر، کیا شوکت تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرق کے ناب آخر!

شرح :نادر شاہ کا دبدبہ ہو یا تیمور کی شان وشوکت، یہ ہمیشہ کے لیے نہیں رہ سکتا بلکہ تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔یعنی اس دنیا میں کسی کی بھی حکومت ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ایک آتا ہے اور دوسرا جاتا ہے۔صرف ان کے کارنامے باقی رہ جاتے ہیں۔

خلوت کی گھڑی گزری ، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوش سحاب آخر!

شرح : بجلی اگر چہ ابر کے آغوش میں پرورش پاتی ہے لیکن ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ اس کی آغوش سے جدا ہو جاتی ہے۔ٹھیک اسی طرح مومن جو کہ خلوت تنہائی میں اپنی خودی کی ترتیب کرتا ہے۔ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس میں جلوت کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی خودی کو دنیا پر ظاہر کر دینا چاہتا ہے۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر!

شرح :اقبال کہتے ہیں کہ میرے اندر جو معانی کا طوفان بر پا تھا، اسے روکنا مشکل تھا اسلئے میں نے اسرار کتاب یعنی قرآن مجید کی تعلیمات کو اشعار کی شکل میں منتقل کر دیا ہے۔جو اس کلام کا بغور مطالعہ کریگا اس پر شعر کی صداقت ظاہر ہوگی۔

UNIT III

علامہ اقبال حیات و شخصیت

علامہ اقبال کے آباو اجداد کشمیر کے برہمن تھے۔ایک مسلمان بزرگ سے عقیدت کی بنا پر اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے شروع میں مسلمان ہوئے۔اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق نے 1861ء میں سیالکوٹ میں ایک مکان خرید لیا تھا۔یہی گھر بعد کو اقبال منزل کے نام سے مشہور ہوا۔اقبال اس مکان میں 9 نومبر 1877ء کو پیدا ہوئے۔اقبال کے والد شیخ نور محمد کے بڑے بیٹے کا نام شیخ عطا محمد اور چھوٹے بیٹے کا نام شیخ محمد اقبال رکھا گیا۔عطا محمد نے اپنے بیٹوں کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی شیخ محمد اقبال کو بھی اعلی تعلیم دلوائی،انگلستان بھیجا اور تمام اخراجات برداشت کیے۔اقبال کی والدہ کا اصل نام امام بی بی تھا جو"بی بی" کے نام سے مشہور تھیں۔انھوں نے اقبال کی تربیت 37 با شفقت و محبت سے کی تھی اس کا اقبال کے دل پر بہت گہرا اثر تھا۔یہی وجہ ہے کہ 1914ء میں بی بی کے انتقال پر اقبال نے"والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے عنوان سے ایک معرکہ آرا نظم کہی۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر اور کتب میں ہوئی۔ان کے والد شیخ نور محمد چاہتے تھے کہ اپنے بچے کو دینی تعلیم سے آشنا کرادیں۔لہذا اقبال کو مولانا غلام حسن کے یہاں بھیجنا شروع کیا جو سیالکوٹ کے مشہور عالم تھے۔بعد کو ان کے والد نے سید میر حسن کے مشورے پر انہیں اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخل کر دیا جہاں سید میر حسن خود بھی عربی و فارسی پڑھاتے تھے۔اس زمانے میں سید میر حسن نے نہ صرف اقبال کو فاری ادبیات سے آگاہ کیا بلکہ عربی بھی پڑھائی اور ساتھ ہی مشرقی حکمت،تصوف اور فلسفے کے رموز اس طرح ذہن نشین کرایا کہ اقبال کو اس سلسلے میں مزید ذوق وشوق پیدا ہوگیا۔اقبال نے 1893ء میں میٹرک اور 1895ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے۔میں اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔یہاں ان کی ملاقات پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی۔آرنلڈ نے بڑی توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔اقبال کالج میں بھی آرنلڈ سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کی نجی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔اقبال نے 1897ء میں بی اے اور 1899ء میں فلسفے میں ایم اے کیا۔1905ء میں اعلی تعلیم کے لیے

اقبال انگلستان گئے اور تین سال قیام کیا۔ اس عرصے میں انھوں نے میونخ یونیورسٹی سے 1907ء میں 'فلسفہ عجم' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور 1998ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

اقبال نے اپنی تعلیمی زندگی میں بہتوں سے استفادہ کیا لیکن اسکاچ مشن اسکول کے استاد سید میر حسن اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر تھامس آرنلڈ نے ان کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ۔ یہ وہی تھامس آرنلڈ تھے جو پہلے علی گڑھ میں پروفیسر رہ چکے تھے اور جنھیں مولانا شبلی کی صحبت میں اسلامی ادبیات سے گہری دل چسپی پیدا ہو چکی تھی۔ مولانا میر حسن کی تعلیم و تربیت کے زیر اثر اقبال میں اسلامی ادبیات اور شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ اقبال کا طبعی رجحان فلسفے کی طرف پہلے سے تھا، پروفیسر آرنلڈ نے اس میں جلا پیدا کر دی۔ 1994ء میں پروفیسر آرنلڈ انگلستان چلے گئے تو اقبال نے نالہ فراق' کے عنوان سے ایک نظم کہی۔ اور بالآخر 1995ء میں اقبال بھی انگلستان چلے گئے اور وہاں بھی انھوں نے پروفیسر آرنلڈ کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا۔ انگلستان میں پروفیسر نکلسن اور بعض دوسرے اہل علم نے بھی اقبال کی ذہنی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

اقبال کی پہلی شادی 1893ء میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ اس سے ایک بیٹی مریم اور ایک بیٹا پیر آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ یہ شادی معاشرتی زندگی کے لیے کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ انگلستان سے واپسی پر اقبال نے لاہور کے کشمیری خاندان کی لڑکی سے نکاح کیا۔ لیکن چند ناخوشگوار واقعات کی بنا پر رخصتی اس وقت عمل میں نہیں آئی۔ پہلی اور دوسری شادی کے ان نتائج نے اقبال کو پہنی الجھنوں میں ڈال دیا۔ کچھ دنوں بعد اقبال کے ایک دوست لدھیانے سے رشتہ لائے اور اس لڑکی کے ساتھ اقبال کی شادی ہوگئی۔ اس کے بعد گجرات والی پہلی بیوی بھی آ گئی اور دونوں انارکلی والے مکان میں اقبال کے ساتھ رہنے لگیں۔ اس درمیان لاہور والی دوسری بیوی سے بھی غلط نہی دور ہوگئی اور اقبال نے دوبارہ نکاح کر کے شادی کر لی جن کے بطن سے جاوید اقبال اور منیرہ پیدا ہوئی۔ اس شادی سے اقبال کو پہنی سکون و اطمینان حاصل ہوا۔ اقبال اس شادی کے بعد اپنی ازدواجی زندگی کو ہر طرح کامیاب سمجھتے تھے۔

انگلستان جانے سے پہلے اقبال کئی سال تک تعلیمی اداروں سے منسلک رہے۔ ایم اے کرنے کے بعد سے 1993ء تک اورینٹل کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے معاشیات، منطق، نفسیات اور تاریخ پڑھاتے رہے۔ اسکے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھانے لگے۔ یہاں ان کے تدریسی مضامین فلسفہ، انگریزی اور سیاسیات و تاریخ

تھے۔ 1905ء میں انگلستان جانے کے بعد وہاں بھی لندن یونی ورسٹی میں چھ مہینے تک عربی کے پروفیسر رہے۔ 1998ء میں یورپ سے واپسی پر انھوں نے وکالت کو مستقل ذریعہ معاش بنایا۔ 1890ء میں سیالکوٹ سے تعلیم کی غرض سے لاہور آنے کے بعد اقبال لاہور کے ہو کر رہ گئے۔ 1905ء تک ان کا قیام بھائی دروازے کے اندر رہا۔ 1908 1905ء میں یورپ میں مقیم رہے۔ 1998ء سے 1921ء تک ان کا قیام انارکلی والے مکان میں 1921ء سے 1935ء میکلوڈ روڈ والے گھر میں اور 1935ء سے 1938ء تک میورو ڈ (موجودہ اقبال روڈ) والی کوٹھی میں قیام رہا۔ صرف اقبال روڈ والا مکان 'جاوید منزل' ان کا ذاتی تھا۔ لاہور میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے ساتھ ہی وہ وقفے وقفے سے مختلف ملکوں کی سیاحت کے لیے بھی جاتے رہے۔ یورپ کا سفر انھوں نے پہلی بار 1905 تعلیم کی غرض سے کیا۔ 1931ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے دوبارہ انگلستان گئے اور واپسی میں اٹلی، مصر اور فلسطین میں بھی قیام کیا۔ 1932ء میں گول میز کانفرنس میں علامہ سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ساتھ شہنشاہ افغانستان کی دعوت پر انھوں نے افغانستان کا سفر کیا۔

علامہ اقبال کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور یہ حلقہ بیرون ملک تک پھیلا ہوا تھا۔ اقبال جہاں بھی رہے سادگی، شرافت نفس اور اخلاق کی بدولت وہ خاص و عام میں مقبول رہے۔ ان کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ایک معمولی اور اجنبی آدمی سے لے کر بڑے سے بڑے عہدیدار اور رئیس ان سے مل سکتا تھا۔ اقبال کی عام زندگی حد درجہ سادہ و پاکیزہ اور آج کل کے مغربی لوازم وغیر ضروری تکلفات سے پاک تھی۔ لباس، پوشاک، رہن سہن مجلسی آداب و رسوم سب سے مشرقیت پسندی اور سادگی جھلکتی تھی۔ اقبال روزمرہ کی زندگی میں عام طور پر پنجابی میں بات کرتے تھے لیکن جرمن، انگریزی اور عربی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ زبان کے استعمال کے سلسلے میں کسی تعصب کا شکار نہ تھے۔ بچپن اور لڑکپن میں اقبال کو ورزش کرنے، پتنگ لڑانے، کبوتر اڑانے اور بٹیر میں پالنے کا شوق بھی تھا۔ پھر میشوق شعر گوئی و شعر خوانی میں بدل گیا۔ اقبال کو موسیقی سے بھی خاص لگاؤ تھا اور خاص دوست و احباب کے ساتھ رقص و سرور کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔

اقبال حد درجہ سنجیدہ اور متوازی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک نہایت ذمہ دار شہری اور فرد کی حیثیت سے بسر کی۔ انھوں نے شاگرد، استاد، بیٹا، دوست عزیز، وکیل اور سیاسی کارکن کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ اپنے آپ کو غور و فکر اور شعر و فن کے لیے زیادہ موزوں پاتے تھے۔

اقبال نے خود بھی اپنی ذاتی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس لیے مطالعے کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا تھا، اسے غور و فکر کا موضوع بنا کر فلسفہ حیات بنا دیا۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کا تقاضا ہی تھا کہ تصوف اور دینی مسائل سے انھیں گہری دل چسپی پیدا ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے ہی اقبال میں اسلام کی محبت رچ بس گئی اور علم کے اضافے کے ساتھ اس میں پختگی اور شدت پیدا ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ ان کی شخصیت ایک عظیم اسلامی مفکر میں ڈھل گئی۔

اقبال جب گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اس زمانے میں اپنی پہلی غزل مشاعرے میں پڑھی۔ اسی مشاعرے میں اقبال نے وہ شعر پڑھا جس کا چرچا بہت دیر تک ارباب ذوق کے حلقوں میں رہا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

ہم موت مانگتے ہیں، وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے کسی نے اور ہی معنی وصال کے

اقبال یورپ جانے سے پہلے اردو کی شعری روایت کے سارے رموز سیکھ لیے بلکہ وہ اس بات سے بھی آگاہ ہو گئے کہ لفظ معنی میں کتنا نازک رشتہ استوار ہے۔ اقبال نے اپنے مطالعے کی وسعت اور اپنی بصیرت کی بنا پر نہایت دقیق افکار اور لطیف تصورات کو جذبے میں سمو کر ایسی ہیت بخشی جس کا آہنگ اور نغمہ بھی معانی کے مطابق تھا۔ اقبال کے شعور تخلیق کی تربیت، یہی پہلو سب سے پیچ دار اور پر اسرار ہے کہ انھوں نے فلسفیانہ تعقلات سے لے کر تغزل کی واردات تک لطیف سے لطیف اور نفیس معانی کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔ اقبال کی شعری تربیت ایک طرح سے 1905ء تک مکمل ہو چکی تھی۔

علامہ اقبال کے مطالعے میں سب سے زیادہ رہنے والا صحیفہ قرآن پاک تھا۔ دوسری کتابیں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ قرآن کی تلاوت وہ یہ سمجھ کر کرتے تھے گویا وہ انھیں پر نازل ہوا ہے۔ اکثر یہ ہوتا کہ تلاوت کرتے کرتے اشک رواں ہو جاتے اور رقت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اقبال کو وفات سے چار سال پہلے نزلے کی شکایت ہوئی پھر اس نے ایسی طوالت و پیچیدگی اختیار کر لی کہ ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔ بہت علاج معالجہ ہوا لیکن صحت لوٹ کر نہیں آئی اور بالآخر 21 اپریل 1938ء کو وہ اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔

اقبال کی اردو شاعری کے مختلف ادوار

اقبال کی شاعری کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلا دور ابتدا سے 1995ء تک یعنی انگلستان جانے سے قبل تک پر محیط ہے ۔ دوسرا دور قیام یورپ کا ہے یعنی 1995ء سے 1998ء صرف تین برسوں پر مشتمل ہے ۔ تیسرا دور یورپ کی واپسی کی بعد سے آخری ایام تک یعنی 1908ء سے 1938ء تک کے کلام پر محیط ہے ۔

پہلے دور میں اقبال حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے ۔ مناظر قدرت اور مظاہرات فطرت کے مشاہدے سے پوشیدہ راز کو حل کرنا چاہتا ہے ۔ چنانچہ پہاڑ ، باغ ، سورج ، چاند ، ابر ، پھول اور شمع ہر چیز کو وہ اپنا مخاطب بنا تا ہے اور طرح طرح کے سوالات کرتا ہے ۔ اس دور میں اقبال معلم اخلاق بھی نظر آتا ہے اور وطنیت اور ہندو مسلم اتحاد کے بھی گن گاتا ہے ۔ کہیں کہیں حکمت و فلسفہ اور تصورات کے رموز و نکات سے بھی کام لیتا ہے اور بعض نظموں خصوصاً بچوں سے متعلق نظموں میں انگریزی شعرا سے بھی استفادہ کرتا ہے ۔ 'بانگ درا (1924) میں بھی اقبال کی شاعری کو اسی ترتیب سے تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ۔ 'بانگ درا کا آغاز اقبال کی مشہور مسدس نما نظم "ہمالہ" سے ہوتا ہے ۔ پہلے حصے کی غزلیں بیشتر ذرائع اور امیر مینائی کے رنگ میں ہیں ۔ نظم کا حصہ دو خاص موضوعات اخلاقیات و سیاسیات سے متعلق ہے ۔ اخلاقی موضوع کے تحت مناظر فطرت اور بچوں کی نظمیں آتی ہیں ۔ بچوں کی نظموں میں مکڑا اور مکھی' گائے اور بکری' پہاڑ اور گلہری' بچے کی دعا' ہمدردی' ماں کا خواب' پرندے کی فریاد' اور جگنو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ مناظر فطرت کی جاذب نظر تصویر میں ہمالہ گل رنگین ابر کہسار' ایک آرزو ماونو' ابر اور " کنار راوی میں نمایاں ہیں ۔ سیاسی رنگ کی نظمیں جن میں وطن پرستی اور حب الوطنی کے جذبات غالب ،، دو ہیں ان میں ہمالہ آفتاب ترانہ ہندی' نیا شوالہ اور ہندوستانی بچوں کا گیت اہم ہیں ۔ اقبال مسلسل فکر و تجسس کے ساتھ ساتھ عالم تذبذب میں بھی نظر آتا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے موضوعات کا کوئی خاص رخ کا پیٹ نہیں چلتا ہے ۔ حسن و عشق کے بیان میں جدت کے آثار ہیں ۔ سیاسی رنگ کی نظموں میں وطن سے گہری محبت کا ثبوت ملتا ہے ۔ لیکن آزادی کیا ہے؟ وطنیت کیا ہے؟ اور ان کے لوازم و عناصر کیا ہیں؟ یہ باتیں زیر بحث نہیں آئیں لیکن اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ماحول سے مطمئن نہیں ہے اور کسی دوسرے ماحول کی تلاش میں ہے ۔ یہ

تلاش و بے چینی گل رنگین چاند کنار راوی صبح کا ستارہ'' جگنو موج دریا'' ماں' کے ان اشعار میں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے:

مری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقی موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی
اس گھڑی عمر کے چھپنے سے تو ظلمت اچھی
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو
نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں
طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں

علم و آگہی کی یہی تشنگی اور قلب و روح کا یہی کرب اقبال کو حصول تعلیم کے لیے یورپ کے سفر پر آمادہ کرتا ہے۔ یورپ جانے سے قبل اقبال حضرت نظام الدین اولیا کے آستانے پر حاضر ہو کر نظم التجا مسافر کی شکل میں اپنا حال دل سناتے ہیں:

چمن کو چھوڑ کر نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور شروع میں شہرت بھی ان کی غزل سے ہوئی:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

شروع میں اقبال، داغ اور امیر مینائی سے متاثر نظر آتے ہیں۔اقبال نے داغ کی شاگردی قبول کی اور انھیں ابتدائی غزلیں دکھائیں۔یہی سبب ہے کہ اقبال نے داغ کے رنگ میں غزلیں کہیں :

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدے کرتے ہو عیار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

پوری غزل داغ کے مخصوص رنگ میں ہے۔اسی طرح چند اشعار دوسری غزلوں میں بھی مل جائیں گے لیکن انھیں غزلوں میں بعض ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو داغ کے رنگ سے الگ ہیں اور ایک نئے انداز شن کے ابتدائی خدوخال کی نشاندہی کرتے ہیں۔چند شعر ملاحظہ کریں:۔

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشین سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ان اشعار کے اسلوب اور تراکیب اور تشبیہات پر رنگ قدیم کی جھلک صاف نظر آتی ہے جو فارسی کے زیر اثر اردو میں مقبول تھا۔اقبال کے کلام پر بھی شروع سے ہی فاری کے اثرات نمایاں ہیں۔عربی اور فارسی سے طبعی مناسبت اقبال کو تر کے میں ملی تھی۔سید میر حسن جیسے استاد نے اس میں مزید گہرائی و گیرائی پیدا کر دی۔فارسی کا یہی ذوق، جدید سے جدید تر کا طبعی میلان اور طبیعت کا فلسفیانہ رجحان اقبال کو بہت جلد داغ سے غالب کی طرف لے گیا۔اقبال، ذرائع کے شاگرد ہونے کے باوجود معنوی حیثیت سے غالب سے قریب نظر آتے ہیں۔اس کا واضح ثبوت غالب پر اقبال کی نظم ہے جو 1995ء سے پہلے کی تخلیق ہے۔جس میں انھوں نے غالب کو گوئے کا ہمسفر ٹھہرایا ہے

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اقبال کی عام شاعری پر غالب کے معنوی اثرات واضح نظر آتے ہیں :

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل ہے تجھ سے راوفن وا کرے کوئی
(غالب)

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
(اقبال)

ممکن نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
(غالب)

در یوزہ تا کجا طور گری مثل کلیم
اپنی مٹی سے عیاں شعلہ سینائی کر
(اقبال)

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
(غالب)

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
(اقبال)

قید حیات بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
(غالب)

ریاض دہر میں نا آشناس بزم عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محروم مسرت ہوں
(اقبال)

مندرجہ بالا اشعار غالب سے متاثر ہوکر کہے گئے ہیں ۔غالب کے اس معنوی اثر سے قطع نظر، ایک مقطع ملاحظہ فرمائیں :

اقبال لکھنو سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

ظاہر ہے کہ اقبال کی جدت پسند طبیعت کسی کی پیروی پر رضامند ہونے والی نہیں تھی :

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

یہ اشعار طرز فکر اور اسلوب دونوں اعتبار سے روایتی غزل سے الگ ہیں ۔دونوں شعر اس بات کی طرف اشارہ

کرتے ہیں کہ اقبال کی غزل آگے چل کر آزادی وطن اور عقل وعشق کے باب میں کیا رخ اختیار کرنے والی ہے مختصرا یوں کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری ایک ایسے مسافر کا سفر ہے جو منزل اور سمت منزل سے بے خبر ہے۔

قیام یورپ نے اقبال کو مغرب کی مادہ پرستانہ زندگی سے بیزار کر دیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ مبلادی اور روحانیت سے خالی معاشرہ نسل آدم کے لیے ایک مہلک خطرہ ہے چنانچہ مغرب سے مایوسی، جمالیات کے گہرے مطالعے اور ماضی کی یاد کے نتیجے میں وہ تہذیب اسلامی کی طرف راغب ہوئے۔ 1995ء سے 1998ء تک یعنی قیام یورپ کے زمانے سے تعلق رکھنے والی نظموں میں پہلی محبت' دوسری حقیقت حسن اور تیسری پیام' ہے۔ بیشتر نظمیں ہیں لیکن ان میں حسن ومحبت کے موضوعات اور خاص طور پر' پیام' کے آخری دو شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال یورپ سے تعلیم کی اعلی ڈگریاں اور علم وفکر کی کشادہ وادیاں تو لے کر لوٹے لیکن مغرب سے نا آسودہ و بیزار لوٹے :

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں ، مجھ کو تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا، بزم کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

یورپ میں تین سال رہ کر اقبال نے تجربے اور وسیع مطالعے کے ذریعے یہ بات پوری طرح محسوس کر لی کہ دنیا کی تہذیبی زندگی کو جو چیز تہ و بالا کر رہی ہے وہ ہے وطنیت وقومیت کے بارے میں اہل مغرب کا وہ گمراہ کن تصور جسے و غلطی سے انسانی فکر ونظر کا منتہا سمجھ بیٹھے ہیں۔ اقبال کے خیال میں یورپی اقوام کا عقلیت پر ضرورت سے زیادہ زور مشینی ایجادات پر بے جا افتخار وانحصار، کائنات کی مادی تعبیرات اور روحانیت سے بے نیازی واجتناب ایسی چیز میں ہیں جو مغربی تمدن کے حق میں سم قاتل ثابت ہوں گی۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب پنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

تاہم اس دور کو اقبال کے پیغام کی ترسیل کا نہیں صرف تشکیل کا دور کہہ سکتے ہیں۔اس لیے کہ اس دور کی نظموں اور غزلوں میں مغرب کے تہذیبی اور سیاسی رویوں سے اقبال کی بے زاری و بے اطمینانی کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ مغرب کے نظام حیات اور فلسفۂ فکر کے مقابلے میں کس قسم کا نظام حیات اور فلسفۂ فکر چاہتے ہیں۔بعض نظموں میں اس طرح کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیام کی نوعیت اور پیش کش مغرب سے الگ اور مختلف ہوگی:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرز کلام ا اور ہے
موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور جام اور ہے
ہیں ہزاروں اس کے پہلو
رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں ہیرا کوئی تراشا ہوا رکھتا ہوں میں
جستجو کل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں، در دلا دوا رکھتا ہوں میں

'بانگ درا کے حصہ سوم میں 1998ء سے 1924ء تک کا کلام شامل ہے۔اقبال یورپ میں رہ کر ان حقائق کو اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ مغرب کی مادہ پرستی،انسانی معاشرے سے روحانی اور اخلاقی قدروں کا خاتمہ کر رہی ہے۔اقبال کی 1924ء تک کی شاعری دوسرے دور کی شاعری سے بہت قریب نظر آتی ہے۔اقبال کو یہ اور گردش جام اور ہے احساس یورپ میں ہی ہو چکا تھا کہ رنگ و نسل اور وطنیت و قومیت کی بنیادوں پر لوگوں کو چھوٹے چھوٹے طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے کہ طاقتور قوموں کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لینے میں آسانیاں ہوگئی ہیں۔ جمہوریت کے نام پر سرمایہ دار اور خود پرست نفع خور سارے زمانے کا خون چوس رہے ہیں۔مہلک ہتھیاروں کی ایجاد نے ظالموں کے لیے جبر ظلم کی راہیں اور بھی ہموار کر دی ہیں۔مغرب کا ظلم تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف بڑھ رہا ہے اور مشرق وسطی کے مسلم ممالک میں ان کی دست درازی اور مداخلت کا خطرہ قریب آتا جا رہا ہے۔جنگ عظیم کے

بادل فضا پر چھا رہے ہیں۔ یہ تھے اقبال کے مشاہدات و تجربات جن کے اثرات 1908ء سے 1924ء تک کی شاعری میں نمایاں ہیں۔لیکن تفکر و اضطراب کم و بیش اس دور کی تمام نظموں میں جھلکتا ہے لیکن 'شکوہ، جواب شکوہ' مسلم' شمع اور شاعر' 'شکو' 'شکوہ' مسلم' شاعر' "ہلال عید' ترانی ملی' رات اور شاعر اور 'بزم انجم میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

اقبال کی شاعرانہ عظمت

اقبال نے شاعری کی شروعات رواج کے مطابق غزل سے کی لیکن بہت جلد نظموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ صنف اظہار خیال کے لیے زیادہ کارآمد تھی۔ انھوں نے فارسی کی طرح اردو میں طویل نظمیں نہیں لکھیں۔ مگر اردو میں ان کی مختصر اور طویل تعلموں کی تعداد کیفیت اور کمیت، دونوں کے لحاظ سے اتنی ہے کہ وہ نظم کے سب سے بڑے شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے آرڈ ونظم کو جو وسعت، گہرائی اور فکری رفعت عطا کی ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے غزل کو بھی صحیفہ کائنات بنایا ہے مگر دراصل وہ نظم کے شاعر ہیں اور ان کے یہاں غزلوں کے مقابلے میں تعلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اقبال یوں تو غزل، مثنوی، مسدس، قطعہ سب ہیئتوں کو برتتے ہیں لیکن شروع سے ان کی مرغوب بیت ترکیب بند رہی ہے۔ غزل ہو یا نظم دونوں میں اقبال نے اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائی ہیں۔

اقبال کی شاعرانہ عظمت کا راز اس میں پنہاں ہے کہ انھوں نے اکثر اشعار میں خدا کے ساتھ شاعرانہ شوخیاں کی ہیں۔ انھوں نے خودی کے فلسفے کے ساتھ ساتھ تصور عشق فقر، حیات اور مون کی بھی وضاحت کی ہے۔ ان کے یہاں قدیم اور جدید طرز کی شاعری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس میں تغزل اور تصوف بھی ہے اور فلسفیانہ اور سیاسی نظمیں بھی ہیں۔ اقبال کا اسلوب اور انداز بیان بہت خوب صورت ہے اور اس کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب بھی یہی ہے:

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا، سینہ کائنات میں
عشق کی تیغ جگردار اڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

یہاں جینے کی پابندی ، وہاں مرنے کی پابندی
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اقبال کے یہاں بعض مقامات پر طنز بھی نمایاں ہے جس کی وجہ سے کلام میں دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ان کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دریا کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔اس سے ان کے عمیق مطالعے فکری بلندی اور تخیل پروازی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کے یہاں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں زندگی کے حقائق ومعارف کو اس دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنا تاثر چھوڑ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اشعار زبان زد خاص وعام ہو گئے ہیں۔

اے طائر ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر
پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا نہ تن

اقبال کے یہاں بے باک، پرسوز اور شوخ لب ولہجہ بھی موجود ہے جو بندے کو خدا سے ہم کلام ہونے کا حوصلہ بخشتا ہے۔اقبال نے فکر وفن کی جس بلند سطح سے بندے کو خدا سے ہم کلامی کا شرف بخشتا ہے اس میں گستاخی کا شائبہ نہیں ہے۔عشق جو غزل کا محبوب موضوع رہا ہے اسے اقبال مختلف پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ان کے یہاں عشق محض دو دلوں کے جوڑنے اور دکھی انسان کی دلجوئی کا وسیلہ نہ رہا بلکہ حیات وکائنات کو بجھنے کا موثر طریقہ ہے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق کسی اضطراری کیفیت یا جنسی جذبے کا نام نہیں ہے بلکہ عشق نام ہے پاکیزہ واعلی مقاصد ہیں کے حصول اور بے پناہ لگن کا۔اقبال نے اپنی غزلوں کو شش شخصی تاثرات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک ایسا اجتماعی وآفاقی رخ دیا ہے جس نے غزل کو وسعت معانی اور وحدت مطالعے کے لحاظ سے نظم کے مدمقابل کھڑا کر دیا۔ان غزلوں میں معنوی تسلسل یا وحدت تاثر کے ساتھ ساتھ خارجی آہنگ بھی موجود ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز وشب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

یہ غزل نظم کی سی وحدت تاثیر رکھتی ہے۔اس غزل میں اقبال کے فلسفہ کا نچوڑ ہے۔اقبال نے اردو غزل کی روایت کو ایک نئی آواز اور نئے لب و لہجے سے آشنا کیا اور غزل کا ایک نیا مفہوم وسیع معنوں میں سامنے آیا ہے۔یا اقبال کی شاعرانہ عظمت کی دلالت ہے۔اب نظم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اقبال کے یہاں 'بانگ درا' کی نظموں میں حیرت انگیز تنوع ملتا ہے۔یہاں مختصر نظموں اور طویل نظموں دونوں کا معیار نہ صرف اپنے پیشروں سے مختلف ہے بلکہ ان میں کامیاب شاعری اور معیاری شاعری دونوں کے نمونے مل جاتے ہیں مختصر نظموں میں ہمالہ مرزا غالب' عقل و دل' ایک آرزو، جگنو، نیا شوالہ وغیرہ اور طویل نظموں میں شکوہ، جواب شکوہ' شمع و شاعر' والدہ مرحومہ کی یاد میں، لینن، فرشتوں کا گیت' فرمان خدا' جبریل و ابلیس' اور شاہین وغیرہ نظموں میں نمایاں اہمیت رکھتے ہیں اور طویل نظموں میں مسجد قرطبہ' ساقی نامہ' ذوق وشوق' شعاع امید' وغیرہ اہم ہیں اور ارمغان حجاز' میں طویل نظم مجلس شوری کے علاوہ 'مسعود مرحوم اور حضرت انسان' قابل قدر ہیں۔

اقبال کی بیشتر نظمیں کسی فوری واقعے یا کسی خارجی امر سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود اس میں ایسا ،سلوہ تاثیر پیدا ہو گیا ہے کہ اس کی حیثیت دیر پا اور آفاقی ہو گئی ہے۔ان کی نظمیں زبان و بیان کے اعتبار سے رنگین اور دل آویز ہیں۔لیکن اقبال کی کامیابی کی وجہ زبان و جذبات کی لطافت ہی نہیں بلکہ ان کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو میں موثر استعارے اور فارسی اور پنجابی اور ہندوستان کی دوسری بولیوں کے الفاظ داخل کر کے اس زبان کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کی عظمت ان کے فلسفے یا افکار کی گیرائی وگہرائی کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ فکر کے شعر بنے یا فلسفے کے شعر میں ڈھلنے کی وجہ سے ہے۔ اقبال کے یہاں حکمت ایک رابطہ سنجیدگی اور تسلسل رکھتی ہے یعنی ان کے شعری افکار میں ہمیں ایک وحدت ملتی ہے جو ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ شروع میں اقبال کے یہاں تشبیہات واستعارات کی فراوانی ہے۔ اقبال کے یہاں ابتدا سے ہی ہلال عید کے لیے حلقۂ طاؤس، رکوع، سورۂ نور اور کاسہ سوال جیسی نادر تشبیہیں نظر آتی ہیں اور ہمالہ اور جگنو جیسی نظموں میں شاعری کو ایک بلند مرتبہ تک پہنچا دیتی ہیں۔ اقبال کی تشبیہات واستعارات رفتہ رفتہ نشانات اور پھر علامات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان کی علامت نگاری اپنے مذہبی اور تہذیبی سرمائے سے جانی پہچانی جاتی ہیں اور ان میں اپنے سوز نفس سے ایک نئی زندگی اور ایک نیا جادو بھر دیتی ہے۔ مثلا شاہین، لالہ عشق قلندر، پروانہ، جگنو وغیرہ۔

اقبال کی طویل نظموں میں مسجد قرطبہ، ساقی نامہ" اور" ذوق وشوق' کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ مسجد قرطبہ بیان قلم ہے اور علامتی نظم بھی، وقت عشق کا سیل جو وقت کو تھام لیتا ہے۔ فن جو مشق کے طفیل وقت پر حکمرانی کرتا ہے۔ مردان حق کے قافلے اور عشق کی منزلیں، کسی اور زمانے کا خواب، ان موضوعات کو جس جوش، ولولے، روانی اور شگفتگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ اردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ ساقی نامہ دوسری طرح کی نظم ہے۔ ساقی نامہ' کا اعجاز یہ ہے کہ یہاں ایک مصرعے میں داستان حیات کے کتنے اوراق آ گئے ہیں 'ذوق وشوق' منظر نگاری کا ایک ایسا نمونہ پیش کرتی ہے جس میں کوئی لفظ آرائشی نہیں بلکہ پہلو دار ہے اور دشت میں صبح کا ساں آخر میں اس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

مجموعی طور پر اقبال کی شاعری میں سوز وگداز ہے۔ لیکن میر کے سوز وگداز سے اقبال کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ میر کا محبوب فرد ہے اور اقبال کا محبوب قوم ہے۔ اس لیے اقبال کی بیشتر شاعری میں قوم کی سربلندی کا پیغام ملتا ہے۔ ان کی اکثر غزلوں میں بڑی روانی اور سلاست پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ان کی غزلوں اور نظموں میں شاعری اور موسیقی کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ اقبال کے بیان کرنے کا انداز بہت دل کش ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو سربلندی، خودداری، عزت نفس اور بلند حوصلگی کی تعلیم دی ہے اور انھوں نے شاعری کو اپنے پیغام کا ذریعہ بنایا ہے۔ اپنے پیغام

کی اشاعت کے لیے انھوں نے جس طرح تشبیہ، استعارہ، مجاز اور کنایہ سے کلام میں بلاغت اور دل کشی پیدا کی ہے، وہ اقبال کا ہی خاصہ ہے۔ اقبال ایک فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبہ شاعر بھی ہیں۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں جو صنائع معنوی کو برحل استعمال کر کے اپنی شاعرانہ عظمت کا نقش دلوں پر ثبت کر دیتے ہیں۔

آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا غم
پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کو ہ ودمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ

مسجد قرطبہ کا یہ مطلع بھی اقبال کی شاعرانہ عظمت کی دلالت کرتا ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

UNIT-IV

تصورخودی

"خودی" اقبال کا پیغام یا فلسفہ حیات ہے۔انسان کیا ہے؟ انسانی زندگی کیا ہے؟ کائنات اور اس کی اصل کیا ہے؟ اس طرح کے کتنے سوالات ہیں جن پر انسان شروع سے ہی غور وفکر کرتا رہا ہے۔قدیم یونیانیوں نے اس کا جواب میڈیا تھا کہ کائنات یا انسان کا وجود ش دھوکا ہے۔ یونیانیوں سے متاثر ہو کر بالخصوص افلاطون کے خیالات کے زیر اثر مشرق ومغرب میں بھی ایک مدت تک یہی تصور قائم رہا۔لیکن آخر کار اس افلاطونی فلسفے کے خلاف ریمل ہوا اور انسان نے اپنے وجود کو شک وشبہ سے بالاتر سمجھنا شروع کیا۔ڈیکارٹ نے افلاطونی نظریے کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ دنیا کے متعلق تو خیر سوچا جاسکتا ہے کہ ہے یا نہیں ہے لیکن مجھے اپنے وجود پر شبہ نہیں ہوسکتا۔ یہ زاویہ فکر اقبال کی طبعیت کے عین مطابق تھا اس لیے انھوں نے اس کو بنیاد بنا کر تصور خودی کا نظریہ پیش کیا۔اقبال نے قیام یورپ کے زمانے میں فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ایران کی مختلف ادبی اور لسانی تحریکوں کو غور سے دیکھا تھا اور انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ افراد میں خودی اور خود داری کم ہوتی جارہی ہے۔

"خودی" کا لفظ اقبال کے یہاں تکبر وغرور کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے۔خودی اقبال کے نزدیک نام ہے احساس غیرت مندی کا، جذبہ خود داری کا، اپنی ذات وصفات کے پاس واحساس کا، اپنی انا کو شکست سے محفوظ رکھنے کا، حرکت وتوانائی کو زندگی کی ضمانت سمجھنے کا اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا۔خودی زندگی کا آغاز، وسط اور انجام بھی کچھ ہے۔فرد ولت کی ترقی وپستی، خودی کی ترقی وزوال پر منحصر ہے۔خودی کا تحفظ زندگی کا تحفظ اور خودی کا استحکام زندگی کا استحکام ہے۔ازل سے ابد تک خودی ہی کی کارفرمائی ہے۔اقبال نے ان کا ذکر اپنے کلام میں جگہ جگہ مختلف انداز سے کیا ہے

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کی سہتی ہوئی
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اقبال نے کہیں یہ ظاہر کیا ہے کہ لا الہ الا اللہ کا اصل راز خودی ہے۔کہیں یہ بتایا ہے کہ انسان کی ساری کامیابیوں کا انحصار بھی خودی کی تربیت پر ہے۔خودی زندہ و پائندہ ہو تو فقیر میں شہنشاہی کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے تصرف میں آجاتا ہے۔

خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی
نہیں ہے سنجرو طغرل سے کم شکوہ فقیر
جس بندہ خود بیں کی خودی ہوگئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ وبراق

اقبال نے بعض جگہ خودی کو فرد اور ملت کی زندگی کا مرکز قرار دیا ہے اور بعض مقامات پر خودی اور خدا کے وجود کو لازم وملزوم بتایا ہے۔انسان کو اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لیے خودی کی نمود سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔خودی کی بھرپور نمود انسان کو امر بنا دیتی ہے۔

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے! خدائی
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اور مسلمان کی "خودی" یہ ہے کہ اس میں سچے مومن کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور مومن کی صفات وخصوصیات میں ہیں کہ

ہر لحظ مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں ، کردار میں اللہ کی برہا ن
قہاری و غفاری وقد وی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا مسلمان

"خودی" کیا ہے؟ اور یہ کیسے کیسے کارنامے انجام دیتی ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا متفرق اشعار سے ہوتا ہے لیکن یہ اشعار اقبال کے فلسفہ خودی کی مکمل تصویر کشی نہیں کرتے۔ ان کا فارسی کلام اس کی بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔ اسرار خودی میں اقبال نے خودی کی تعریف تشکیل، عناصر ترکیبی، ارتقائی منازل، مآخذ، فتوحات اور امکانات سب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

خودی کی پائندگی اور تابندگی یہ ہے کہ تخلیق آرزو اور تخلیق مقاصد کے بعد بھی سیرابی نہ ہو بلکہ طلب کی شدت کچھ اور بڑھ جائے۔ یعنی ایک آرزو کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش تا حیات جاری رہے۔ اس ذوق طلب اور شوق آرزو کو صرف سامنے کی دنیا آب و گل تک محدود نہیں رہنا چاہئے (اس لیے کہ یہ خودی پہلی منزل ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نئے نئے تلاش کرنے چاہئیں۔ ایسے جہاں جو نظروں سے پوشیدہ ہیں لیکن موجود ہیں اور خودی کے مسافر کا ان تک پہنچنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

خودی کی یہ ہے منزل اولین
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

خودی کے سفر میں عشق رہبر کا کام کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک وجدانی قوت ہے۔ رہبری کے لئے مرشد کامل سے وابستگی ضروری ہے لیکن ایسے مرشد کامل سے نہیں جو دنیاوی مال و دولت کے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ ذاتی مفاد سے بے نیاز مرد کامل سے رہنمائی و ہدایت طلب کی جائے تو خودی طاقتور بن جاتی ہے

۔اقبال کی نزدیک فقیری دوطرح کی ہے ۔ایک دنیاوی اغراض کے لئے جس کا نام گداگری ہے ۔دوسری خودی کی تعمیر واستحکام اوراعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے ۔پہلی قسم کی فقیری آدمی کو مسکینی ومحکومی اورمحرومی پر رضامند رکھتی ہے ۔دوسری قسم کی فقیری خودی کی تیغ کو آبدار بناتی ہے اور بندوں کے جہانگیری کے راز فاش کرتی ہے ۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

خودی کی ارتقائی منزلیں تین ہیں ۔اطاعت ضدنفس اورنیابت الہی اقبال کےنزدیک انسان کااپنی ذات کی بلندیوں سے آگاہ ہوجانا خودی ہے ۔وہ چاہتے تھے کہ انسان اپنی شخصیت کی اہمیت کو پہچان لے ۔ان کا خیال تھا کہ انسان اللہ کی مخلوقات میں سے ایک اشرف المخلوقات کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا ہے ۔اقبال خود کہتے ہیں احساس خودی ،عرفان نفس اورخودشناسی ہی انسان کی تخلیق کا اصل منشا ہے اورخودی ہی اصل زندگی ہے ۔اقبال خودی کا واضح تصور رکھتے ہیں ۔ان کے یہاں خودی ،خودشناسی کا وہ احساس ہے جوانسان کو خالق کامل کی آقائیت کا احساس کراتے ہوئے اپنی قدروقیمت کو واضح کرتی ہے ۔اقبال انسان میں خودی کو اجاگر کرنے پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ یہ خودی ہی انسان کوحیدوجہد پر آمادہ کرتی ہے اورحرکت وعمل کا سبب بنتی ہے ۔اقبال اس صوفیانہ تصور کے بالکل مخالف ہیں کہ خودی مارنے سے عرفان حق ہوسکتا ہے ۔اس کے برعکس ان کا خیال ہے کہ صرف خودی کو نمایاں کرکے ہی عرفان حق ممکن ہے ۔

تو راز کن فکاں سے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہوجا خدا کا ترجماں ہو جا

اقبال کےنظریے کے مطابق انفرادی خودی کی بیداری سے ہی ساری کائنات بیدار ہوسکتی ہے کیوں کہ ہرفرد، جماعت کا ایک حصہ ہوتا ہے اورفرداور جماعت ایک دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ۔دونوں لازم وملزوم ہیں ۔اقبال نے جماعت بالخصوص ملت اسلامیہ پر زور دیا ہے ۔ان کا خیال ہے کہ انسان اپنی خودی کو ایک حدتک بلند کرلے تو اس کی تصویر خود سنور سکتی ہے ۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی ارتقائی منزلیں تین ہیں۔اطاعت،ضبط نفس اور نیابت الٰہی۔اطاعت ایسے مراد فرض کی ادائیگی اور عملی تائید ہے۔ضبط نفس سے مراو نفسیاتی خواہشوں اور ذاتی اغراض پر قابو پاتا ہے اور جب اطاعت وضبط نفس کی منزلوں سے کسی فرد کی خودی کامیابی سے گزر جاتی ہے تو وہ نیات الٰہی کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔جو خلیق انسانی کا مقصد ہے۔ یہ فرد کی خودی کی بلند ترین منزل ہے۔

اقبال کا تصورِ زمان و مکاں

اقبال نے اپنے فلسفیانہ نظریات میں تصویر زمان و مکاں کو بہت اہمیت دی ہے۔ زبان کی اہمیت ان کی نظر میں اس قدر زیادہ ہے کہ اسے انھوں نے ملت اسلامیہ کے لیے زندگی اور موت کا سوال قرار دیا ہے۔ مکان کا تصور زمان کے بغیر اور زمان کا تصور مکاں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ زمان ایک حقیقت ہے اور زندگی زمان میں ایک مسلسل حرکت کا نام ہے۔ زمان دونوں جانب غیر محدود ہے یعنی ابتداء اور انتہا کی قید سے آزاد ہے۔ نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ مکان بھی لامحدود ہے۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ مکان پیکر بھی ہوسکتا ہے اور میلا محدو حصوں میں تقسیم بھی ہوسکتا ہے۔

زمان و مکاں کی بحث فلسفہ اور الہنیات کے لیے نئی چیز نہیں ہے۔ خصوصاً اسلامی مفکرین کے لیے دل چسپی کا باعث رہی ہے۔ دہی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے مطابق اختلاف لیل و نہار میں خدائے تعالی کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث شریف میں دہر (زماں کو ذات الہی کا مترادف قرار دیا ہے اور صوفیائ کرام و ہر کو ساچینی میں شامل کیا ہے۔ اسلامی مفکرین نے پہلی دفعہ اس گتھی کو سلجھایا۔ یونیانیوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ زمان غیر حقیقی ہے لیکن زمان غیر مسلسل ہے۔ دراصل زمان ایک قسم کی روانی ہے۔ چوں کہ کائنات زمان کے اندر واقع ہوتی ہے اور کائنات ہم سے خارجی حیثیت رکھتی ہے اس لیے کائنات کے وجود میں ہی شک وشبہ کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء کے متعلق جو میرے ارد گرد نظر آتی ہیں میرا علم علمی اور خارجی ہے لیکن میری اپنی خودی کے متعلق میرا علم داخلی اور یقینی ہے۔ میری داخلی زندگی میں کوئی چیز ساکن نہیں ہے جو کچھ ہے وہ ایک مسلسل حرکت ہے۔ زمان کے بغیر مستقل تغیر کا تصور نہیں کیا جاسکتا لہذا ہماری داخلی زندگی کی تمثیل کی بنا پر شعوری وجود کا مفہوم زندگی در زمان ہونا چاہئے۔ غرض موڑ پہلو کا زمان وہ پہلو ہے جس کا عموماً ہمیں احساس ہوتا ہے اور جس پر طوالت اور اختصار ہوسکتا ہے۔ دراصل یہ زمان مکانی ہے جس کو ہم ایک خط مستقیم فرض کرسکتے ہیں لیکن مغربی مفکر برگساں کے نزدیک زمان مکانی میں وجود کی ماہیت محض جعلی ہے۔ اقبال کے نزدیک زمان ایک لمحہ خالص ہے جو ایک غیر متواتر حرکت یا جو میرا آسماں پر ہوا

میرا نہ تھا کوئی والا پر تھا تخیل ہمسفر گزراڑتا جاتا تھا اور جانے چرخ میرا اقبال کے نظیر بیڈ زمان ومکاں کی بنیاد یہ ہے کہ وقت ایک آزاد تخلیقی حرکت کا نام ہے۔ یہ اقبال کے زمان ومکاں کا وہ دور ہے جس کی ابتدا میج معنی میں 1911ء سے ہوئی۔اس دور میں اقبال کے فکر وفلسفہ کی رو سے ایک زماں تو وہ ہے جو ہم صبح وشام، دن اور رات یا دو پہر اور سہ پہر کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔ یہ خارجی زمان ہے اور اسے تسلسل زماں کہتے ہیں۔ جہاں تک نظریہ زماں کا تعلق اقبال کا پہلا دور ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۰ء تک پہنچتا ہے۔اس دور میں وہ ذات باری تعالی اور زماں کو مترادف تصور کرتے ہیں لیکن اس دور میں بھی ان کا احساس اس تصور سے بغاوت کرتا ہے۔ درحقیقت یا اقبال کی اسی ذہنی کشمکش کا دور ہے جس میں وہ زماں کو ذات باری تعالی کا مترادف بھی قرار دیتے ہیں۔اسے حقیقت مطلقہ بھی کہہ رہے ہیں اور توحید سے سرشار ہوتے ہیں تو زمان ومکاں بطلان کہا ہے۔ یہ شعرای دینی تلاش کی عکاسی کر رہا ہے۔تڑپ رہا ہے فلاطوں میاں غیب و حضورتغیر پینی ہے۔ خودی کی زندگی قد رآفرینی (Appreciation) سے اثر آفرینی (Effeciency) یعنی وجدان سے شعور کی طرف حرکت کرنے میں مضمر ہے اور زمان تخیل کی توجہ اسی حرکت کی بدولت ہوسکتی ہے۔

اقبال پہلا مفکر شاعر ہے جس نے زمان کی حقیقت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ برگساں سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس مسئلے پر معروضی اور موضوی دونوں حیثیتوں سے روشنی ڈالی اور کامیاب طور پر پیچیدگیوں کو مل کیا۔اس ضمن میں اقبال نے زیادہ تر فلسفیانہ بحثوں سے کام لیا ہے۔"سیر فلک' سب سے پہلی نظم کہی جاسکتی ہے جس میں اقبال کے نظیر بی زمان و مکاں کا ایک ہلکا اشارہ ملتا ہے۔

تھا تخیل جو ہمسفر میرا
آسماں پر ہوا گزر میرا
اڑتا جاتا ہے اور نہ تھا کوئی
جانے والا چرخ پر میرا

اقبال کے نظریہ زمان ومکاں کی بنیاد یہ ہے کہ وقت ایک آزاد تخلیقی حرکت کا نام ہے۔ یہ اقبال کی زماں و مکاں کا دور ہے جس کی ابتدا صحیح معنی میں ۱۹۱۴ سے ہوئی۔اس دور میں اقبال کے فکر وفلسفہ کی رو سے ایک زماں تو وہ

ہے جو ہم صبح وشام، دن اور رات یا دو پہر اور سہ پہر کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں۔ یہ خارجی زماں ہے اور اسے تسلسل زماں کہتے ہیں۔ جہاں تک نظریہ زماں کا تعلق اقبال کا پہلا دور ۱۹۱۴ سے شروع ہو کر ۱۹۳۰ تک پہنچتا ہے۔ اس دور میں وہ ذات باری تعالی اور زماں کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس دور میں بھی ان کا احساس اس تصور سے بغاوت کرتا ہے۔ درحقیقت یہ اقبال کی اسی ذہنی کشمکش کا دور ہے جس میں وہ زماں کی ذات باری تعالی کا مترادف بھی قرار دیتے ہیں۔ اسے حقیقت مطلقہ بھی کہہ رہے ہیں اور توحید سے سرشاد ہوتے ہیں تو زماں و مکاں بطلان کہا ہے۔ یہ شعر اسی ذہنی کشمکش کی عکاسی کر رہا ہے۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میاں غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اطراف

اقبال کی ذہنی کشمکش کا یہ دور ۳۳۔ ۱۹۳۲ء تک بڑی شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اقبال کی فکر مسلسل حقیقت کی جستجو میں سرگرم سفر رہی ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
راہ یک گام ہے مومن کے لیے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

فکری اعتبار سے اقبال کا نظریہ زماں 'اسرار خودی' سے پیام مشرق' اور پھر جاوید نامہ تک مختلف منزلوں سے گزرا۔ 'بال جبریل' ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی اور ضرب کلیم ۱۹۳۶ء میں۔ یہی وہ دور ہے جب اقبال کے نظریہ زماں زمان میں ہمیں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زباں نہ مکاں لاالہ الا اللہ

صرف یہی نہیں بلکہ اس دور میں زمان کو ان خصوصیات سے لاتعلق قرار دیتے ہیں جو حقیقت مطلقہ کی خصوصیات ہیں اور پیائش زمان و مکاں کو حض ایک مقام فکر قرار دیتے ہیں۔

مقامِ فکر ہے پیمائش زمان و مکاں
مقام ذکر ہے سبحان ربی الا اعلی

اسکے بعد ارمغان حجاز شائع ہوئی جو اقبال کا آخری مجموعہ کلام ہے۔اس میں زماں کے متعلق اقبال کا نظریہ اسرار خودی اور جاوید نامہ میں بیان کیے ہوئے نظریے سے بالکل بدلا ہوا نظر آتا ہے اور یہی اس کی ارتقائی صورت ہے۔اس ضمن میں مندرجہ بالا اشعار اہم ہیں۔

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر

علامہ اقبال نے زیادہ تر زمان ومکاں کے سلسلے میں فلسفیانہ بحثوں سے کام لیا ہے۔ذیل کے اشعار سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حقیقت میں زمان ومکاں کا احساس ان کے تخیل پر کس قدر شدت کے ساتھ کارفرما رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محض فلسفیانہ ہی نہیں بلکہ فنی اعتبار سے اسے سے بہتر شاعری نہیں ہوسکتی۔

سلسلہ روز وشب، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات

سلسلہ روزوشب، تار حریر دورنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب، ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیرو بم ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ تجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز وشب، صیرفیِ کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو، جس میں نہ دن ہے نہ رات!

تصورِ عشق

اقبال کے نظام فکر وفن میں عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ اقبال کے نزدیک عشق ایک عطیہ الٰہی اور نعمت ازلی ہے ۔ اقبال کے ہاں عشق اور ان کے مترادفات یعنی وجدان خود آگہی، باطنی شعور، جنون محبت، دردسوز شوق، آرزومندی جستجو بستی اور سرمستی کا ذکر جس تکرار، انباک اور شدت احساس کے ساتھ ملتا ہے، کسی اور موضوع کا نہیں ملتا۔ محبت جسے بعض نے فطرت انسانی کے لطیف ترین حسی پہلو کا نام دیا ہے اور بعض نے روح انسانی پر الہام و وجدان کی بارش یا نور معرفت سے تعبیر کیا ہے ۔ اقبال نے اپنی نظم "محبت" میں اس طرح واضح کیا ہے ۔

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذت رم سے
قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند داغ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے

یہ ہے وہ محبت یا جذبہ عشق جو اقبال کے دائرِ فکر کا مرکزی نقطہ ہے ۔ کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے ۔ اقبال سے قبل کی فارسی اور اردو شاعری میں عاشق پست مقام پر نظر آتا ہے ۔ وہ در بدر مارا مارا پھرتا ہے، آہیں بھرتا ہے اور گریباں چاک کر کے صحرا کی خاک چھانتا پھرتا ہے ۔ غرض کہ مشق اسے بے موت مار دیتا ہے اور مشق کے مصائب سے تنگ آ کر عاشق پکار اٹھتا ہے ۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہبِ عشق اختیار کیا

(میر)

بلبل کے کاروبار میں ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

(غالب)

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

(میر)

یعنی عشق کے لوازمات میں آہ، نالہ، فریاد، آرزو اور سخت کوشی وغیرہ شامل ہیں۔ جسم کو تکلیف پہنچانا ضروری ٹھہرا اور عاشق کمزور، لاغر اور ناتواں بن گیا اور مایوسی کے اتھاہ اندھیروں میں کھو گیا۔ ان تکالیف کی وجہ سے عاشق وقت سے پہلے ہی اس دنیا سے مایوس ہو جاتا ہے۔

اقبال کے یہاں عشق موت کا باعث نہیں بلکہ زندگی کی علامت ہے۔ عشق زندگی کا ایک محرک عمل ہے۔ عشق سے فرد کی نظر میں بلندی اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے عشق کو زندگی کے لیے ضروری قرار دیا۔ وہ شروع سے ہی اس بات کے قائل رہے ہیں کہ عشق موت کو نہیں لاتا بلکہ زندگی کا پیغامبر ہے۔ نظم عشق اور موت میں اس تصور کو یوں پیش کیا ہے۔

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
بقا کو جو دیکھا فنا گئی
قضا بھی شکارِ قضا ہو گئی
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

اقبال کا تصور عشق دوسرے شعراء کے تصور عشق سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق فنا نہیں بلکہ زندگی کا ضامن ہے۔ اس سے زندگی کا ایسا شدید اور طاقتور احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ساری مادی اور خارجی بندشیں اس کی نظر میں کمزور اور بے وقعت ہو جاتی ہیں۔ دراصل عشق کو اقبال نے مادی حقائق پر روحانی حقائق کی برتری ثابت

کرنے کے لیے اپنایا ہے۔اقبال کے فلسفہ خودی کی تربیت واستواری کا دارومدار بھی عشق کی رہنمائی پر ہے۔

تصوف میں عشق کی دو خاص نوعیتیں ہیں، ایک مجازی اور دوسری حقیقی مجازی سے مراد وہ عشق ہے جس کا تعلق اسی دنیا سے ہے اور حقیقی سے مراد وہ عشق ہے جس کا تعلق خداوندی سے ہو۔عشق حقیقی سے پہلے مجاز سے دل لگانے اور اس میں خود کو فنا کر دینے کا نام عشق حقیقی رکھا گیا۔عشق کے سلسلے میں اس عہد میں علامہ بن عربی کے فلسفہ توحید کا زور تھا اور وحدت الوجود کے نظریے نے مسلمانوں کو ملی زندگی سے بہت حد تک ڈور کر دیا تھا۔اقبال نے اس کی تردید کی اور نظریہ وحدت الوجود کو افلاطون اور ہندو فلسفہ حیات سے ماخوذ بتایا۔اقبال نے متصوفانہ عشق کے مقابلے میں زندگی اور مشق کا ایک ایسا ولولہ انگیز تصور پیش کیا کہ اس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے پھوٹ پڑے ہوئی ہوئی قوم جاگ اٹھی اور مردہ دل دوبارہ زندہ ہوگیا۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں زندگی
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اردو فارسی کی عشقیہ شاعری میں وحدت الوجود کے مسلک کے خلاف اقبال نے انسان کی مختاری اور برتری کا اعلان کیا اور بتایا کہ انسان عالم فطرت کے سامنے مجبور نہیں ہے۔انھوں نے زندگی کا ایک نیا لائحہ پیش کیا۔اقبال کا عشق محبوب کے قرب و وصال کے سلسلے میں اتاحتاط ہے کہ اگر اس کے وجود کا ایک ذرہ بھی خطرے میں ہو تو وہ اس قسم کے وصال کو قبول نہیں کرتا۔اقبال وصال کے مقابلے میں ہجر و فراق کو ترجیح دیتا ہے۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذت طلب
گرمی آرزو فراق ، لذت ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق ، قطرے کی آبرو فراق

اقبال کے یہاں عشق کا تصور اس کے پیش رو شعراء سے بہت مختلف ہے۔ان کے پہلے کے شعراء نے ذاتی تاثر اور شخصی تجربے کی صورت میں عشق کی کیفیات کا بیان کیا ہے۔انھیں کسی نظام یا نظریہ حیات سے واسطہ نہیں تھا۔اس کے برعکس اقبال نے ذاتی تاثرات سے بڑھ کر عام زندگی میں عشق کا مقام تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔اقبال نے اپنے تصور عشق کے بارے میں نکلسن کو ایک خط میں لکھا ہے کہ :

''یہ لفظ عشق بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔یعنی کسی شئے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور جزو بنا کر اپنا لینے کی آرزو کا نام مشق ہے جس کا کمال یہ ہے کہ تخیل پیدا کرے۔قدر و مرتبہ پہنچانے اور ساتھ ہی ادراک کامل سے اسے بروئے کار بھی لائے۔حقیقت میں عشق کا کام یہ ہے کہ عاشق و معشوق کو تمیز کر کے اپنی اپنی جگہ انفرادی شخصیت اور اہمیت بخش دے۔''

اقبال نے عشق اور عقل کے موضوع کو بھی اپنے فلسفہ حیات کے طور پر استعمال کیا ہے۔وہ عقل یا علم پر عشق یا دل کی برتری کا احساس و عقیدہ رکھتے ہیں۔اقبال نے عشق کو آگہی و خود آگہی کا سرچشمہ جانا ہے اور جگہ جگہ عقل کا مذاق اڑایا ہے۔ان کے مطابق عقل ہر مسئلے میں کیا، کیوں، کہاں اور کیسے کے سوالات اٹھاتی اور حقیقت شناسی سے محروم رہتی ہے۔اس کے برعکس عشق چون و چرا اور سود و زیاں کے الجھاوے میں خود کو نہیں ڈالتا۔جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر لیتا ہے اور حقائق تک پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔بعد کو عقل و دل کے امتیازات کا یہی احساس اقبال کے فلسفہ خودی کا آلہ کار بن گیا ہے۔انھوں نے جہاں بھی عشق کی کارآفرینیوں کا ذکر کیا ہے، عموماً عقل کی نارسائیوں کے حوالے سے کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عشق کی تیغ جگردار اڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقام شوق پہ کھویا گیا فرزانہ

عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات

علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ اقبال عقل یا علم کا دشمن ہے۔ ان کا زاویہ فکر ہی ہے کہ حقائق تک پہنچنے میں عقل کے مقابلے میں عشق زیادہ کارگر اور سودمند ہے۔ لیکن انسانی زندگی کی مادی ترقی میں علم و عقل کی بڑی اہمیت ہے۔ البتہ روحانی ترقی جسے اقبال حیات انسانی کا اصل مقصود جانتے ہیں عشق کی رہبری کا محتاج ہے۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

اقبال نے ایک جگہ یہ بتایا ہے کہ عقل و ہوش میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے بلکہ جب سوز سے ہم کنار ہو جاتی ہے تو عشق بن جاتی ہے۔ دراصل اقبال کے نزدیک علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دانش برہانی اور دوسری دانش شیطانی۔ اگر علم و عقل باطنی شعور سے آگاہ نہ ہوں اور صرف جسم پروری کا کام کر رہے ہوں تو یہ دانش شیطانی ہے۔ اس کے برعکس اگر علم و عقل روحانی حقائق سے آشنا ہوں اور منزل تک پہنچنے کا راستہ ہموار کر کے انسان کے دل میں اعلیٰ مقاصد کے لیے آرزو پیدا کرتے ہوں تو یہ دانش برہانی ہے اور اسی دانش برہانی کا دوسرا نام عشق ہے۔

اقبال کا تصور عشق اردو اور فارسی کے دوسرے شعراء سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق محض اضطراری کیفیت، ہیجان جنسی، فنا آمادگی یا محدود دولا حدود میں گم کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں عشق نام ہے ایک عالمگیر قوت حیات کا، جذبہ عمل سے سرشاری کا حصول مقصد کے لیے بے پناہ لگن کا اور عزم و آرزو سے آراستہ جہد مسلسل کا۔

نظریہ فن

آرٹ یا فن کا تعلق چونکہ دوسرے کوائف کی طرح عالم محسوسات سے ہے اس لیے اس کی کوئی ایک تعریف کرنا ممکن نہیں ہے۔ تخلیق حسن کا دوسرا نام ہے۔ بعض کے نزدیک شعر کا حسن، اس کے پیکر، الفاظ اور قوافی و ردیف یعنی ہیت میں ہوتا ہے۔ بعض کے مطابق بیین اس خیال اور مواد میں ہوتا ہے جو شاعر کا ذہن اس ہیت کو عطا کرتا ہے۔ اور بعض کے خیال میں شعر کا حسن نہ تو لفظ میں ہوتا ہے نہ معنی میں بلکہ بیت و مواد کی ہم آہنگی و یک رنگی شعر کے حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ اقبال کے یہاں فن یا آرٹ کے سلسلے میں مذکورہ بالا تینوں قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ ان کا تصور فن بھی بدلتا رہا ہے۔ اقبال کے تصور فن میں عہد بہ عہد تبدیلی اور ارتقا کے اسباب، ان کے خارجی حالات اور ماحول تھے۔ اقبال نے جس تہذیبی ماحول میں آنکھ کھولی، نشو ونما پائی اور پروان چڑھے، اس میں حسن کے وہی نظریات کسی نہ کسی شکل میں جاری وساری تھے۔

فکر سخن کے ابتدائی دور میں اقبال اس خیال سے متفق نظر آتے ہیں کہ قدرتی مناظر یا فطرت کا حسن تحسین کے لائق ہے۔ یہی وہ حسن ہے جسے حسن ازل کہا جاتا ہے اور حسن سے روحانی ہم آہنگی پیدا کر کے خود کو کم کر دینا انسانیت کا کمال ہے۔ 1908ء تک کی شاعری میں ان کے یہاں اس طرح کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
(سلمیٰ۔ بانگ درا)

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا ، شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

اقبال کے فکر وفن کا دوسرا دور 1908ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔حسن کے بارے میں تشکیک تلاش اور بے یقینی کا دور ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اقبال نے زندگی اور فن کے بارے میں فلسفیانہ انداز سے غور وفکر شروع کر دیا تھا اور حسن کا روایتی تصور جو مشرق کی شاعری کا خاص موضوع تھا اور جسے اقبال نے خود اپنی ابتدائی شاعری میں اپنایا تھا، ان کی نظروں میں مشکوک اور بے معنی ہونے لگا تھا۔حسن کے بارے میں اقبال کے تصورات میں کس نوع کی تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور وہ اپنے پرانے تصور حسن کو سوال و جواب کے ذریعے کس طرح تضحیک وطنز کا نشانہ بنا رہے تھے اس کا انداز نظم "حقیقت حسن' سے کیا جا سکتا ہے اور جو اقبال کے آرٹ کا نہایت ہی دل کش نمونہ ہے۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب ِ درازعدم کا فسانہ ہے دنیا

اس کے بعد اقبال کی شاعری کا وہ دور آتا ہے جسے یقین، خود اعتمادی کا دور کہہ سکتے ہیں اور جس میں انھوں نے خودی و بیخودی یعنی اپنے فلسفۂ حیات کی تخلیق کی ہے۔

فن اور رموز فن پر وضاحت اور منطقی انداز سے اظہار خیال کرنے کی روایت اقبال سے پہلے آرڈ و شاعری اور ادب کی تاریخ میں بہت کم نظر آتی ہے۔غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے کلام اور خطوط میں نظریہ فن کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں۔

شمع فروغ حسن سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ ساغر کہے بغیر

غالب کے بعد مولانا حالی نے شعر کی ماہیت اور اس کے عوامل واثرات کی جانب خصوصاً توجہ کی۔اس

طرح غالب اور حالی نے شاعری اور فن شاعری کے بارے میں غور وفکر کی جو طرح ڈالی تھی اس پر اقبال نے ایک شاندار عمارت تعمیر کر دی۔ انھوں نے اپنے فن اور نظریۂ فن کے بارے میں بہت واضح انداز میں جگہ جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ فن یا آرٹ کے متعلق اقبال کی رائے یہ ہے کہ اسے بامقصد ہونا چاہئے۔ ادب برائے ادب کے نظریے کے لیے اقبال کے تصور فن میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کی نظر میں شاعری انسان کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں ہے بلکہ ایک ایسا آلہ ہے جو کارزار حیات میں علم وحکمت سے زیادہ کارگر ہے۔ شاعری اقبال کی نگاہ میں فنون لطیفہ کی شاخوں میں لطیف ترین ہے بشرطیکہ اس کی تخلیق میں لذت جستجو، سوز آرزو اور سچے جذبات کی سرمستی سے کام لیا گیا ہو۔ شاعری کی طرح شاعر کا مقام بھی اقبال کی نظر میں انتہائی بلند ہے۔

جمیل تر ہیں گل ولالہ فیض سے اس کے
نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو

نثر میں بھی اقبال نے جا بجا شاعری اور شاعر کے منصب کے متعلق اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک آرٹ اقوام عالم کی زندگی کا عکس ہے۔ کسی قوم کے آرٹ کو دیکھ کر اس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھینچا جا سکتا ہے لیکن سچا آرٹ وہ ہے جو اپنے کمال کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے وقف کرے۔ فن وہ ہے جو دلوں میں مستقل تلاطم اور ابدی زندگی کا سوز وساز پیدا کرے اور سیاسی وقت ممکن ہے جب شاعر کا نفس خودی کا داعی ومحافظ ہو۔

اے اہلِ نظر، ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

شاعری کو کسی اعلیٰ نصب امین سے ہم آہنگ کرنے اور زندگی کا آلہ کار بنانے پر اقبال اتنا زور دیتے ہیں کہ وہ اس سے ہٹ کر خود کو شاعر کہلوانا بھی پسند نہیں کرتے۔ اقبال نے حسن الفاظ کے بجائے حسن معنی اور اس کی تعمیری سمت کو فن جانا ہے۔ تخلیق فن کا جیسا مکمل شعور اقبال کے یہاں ملتا ہے وہ اس کے کسی ہمعصر شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ وہ بلند پایین کا واضح تصور رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اسے بلند پایئے سے کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

اقبال نے فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں یعنی موسیقی ومصوری اور تمثیل فن تعمیر وغیرہ پر بھی اظہار خیال کیا

ہے۔شاعری کے بعد انھوں نے سب سے زیادہ اثر وتاثر فن تعمیر کا قبول کیا ہے۔اس اثر وتاثر کا اصل محرک ملت اسلامیہ کی محبت اور اس کی اقدار کے تحفظ کا وہی پاکیزہ جذبہ ہے جو ان کی شاعری اور فلسفہ حیات میں جاری وساری نظر آتا ہے۔اندلس کے سفر میں مسجد قرطبہ کا ان کے ذہن وقلب پر اتنا گہرا اثر پڑتا ہے کہ وہ بھی ملت اسلامیہ کی سطوت وشکوہ کا مظہر ہے۔اس لیے اس میں اقبال کو اپنے نظری فن کی جھلک نظر آتی ہے۔اس میں جمال وجلال لازم وملزوم بن گئی ہیں۔

ہے تری شان کے شایاں اس مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکہ بود و نبود
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز
بے تب و تاب دروں میری صلوۃ اور درود

شاعری کی طرح اقبال مصوری اور موسیقی کے فن میں بھی ظاہری صورت یا ہیت سے زیادہ ان کی معنوی حیثیت یعنی مواد کو اہمیت دیتے ہیں۔ان کے نزدیک شاعری،مصوری یا موسیقی کا حسن،لفظ،رنگ اور لے میں نہیں بلکہ اس روح پرور آدرش اور پیغام میں ہوتا ہے جو ایک فنکار اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے انھیں عطا کرتا ہے۔انھون نے فن کے اس معنوی پہلو کو بڑی خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے۔

آیا کہاں سے نالہ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے
دل کیا ہے اس کی مستی وقوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اک نگاہ اٹتی ہے تخت کے

اقبال کے نزدیک فنی تخلیق کا محرک اول شاعری کی داخلی کیفیت یا اس کا باطنی شعور ہے۔اس باطنی شعور کا موثر اور دل کش فنی اظہار اسی وقت ممکن ہے جب کہ فن کار اپنے آدرش کے ساتھ شدید جذباتی لگاؤ رکھتا ہو۔اس کا دوسرا نام خلوص قلب یا خون جگر ہے۔اس کے بغیر فکر وفن کی ساری کوششیں بے کار ہو جاتی ہیں۔اقبال نے خون جگر کا ذکر کئی جگہ کیا ہے لیکن 'مسجد قرطبہ کے ان اشعار کا کچھ اور ہی عالم ہے۔

رنگ ہو یا خشت وسنگ ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود!
قطرہ خون جگر، سیل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرورو سرود!
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال فن کار کے جس خلوص فکر کا ذکر خون جگر کے نام سے بار بار کرتے ہیں اس سے انکی مراد صرف یہ ہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا اسے پوری شدت سے محسوس کر کے کہا ہو، اپنے اوپر اس کی کیفیت طاری کر کے کہا ہو۔ جب تک اظہار ذات کے لیے فن کار کی روح میں یہ بے تابی پیدا نہیں ہوگی، اس کے محسوسات وافکار ظاہری پیکروں میں ڈھل کر بھی بے معنی، بے جان، بے رنگ اور بے اثر رہیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ کہا جائے خون دل میں حل کر کے جذبات کی پوری شدت عقیدت کی بھرپور قوت اور فکر کی مکمل سچائی اور توانائی کے ساتھ کہا جائے۔

اقبال کا سارا کلام شاہد ہے کہ انھوں نے فن اور تخلیق فن کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر خود بھی خلوص نیت کے ساتھ عمل کیا ہے اور میدان کے اسی خلوص کا نتیجہ ہے کہ ان کا فن رنگ ونسل کے جغرافیائی دائروں تک محدود نہیں رہا بلکہ اپنے انفرادی جمال وجلال کے سبب آفاقی بن گیا ہے۔

Course Contributors:

1. Dr. Mohammad Asif Malik
Assistant Professor, Deptt. of Urdu BGSBU, Rajouri

© Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu 2022

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the DDE, University of Jammu.

* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the DDE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed at : Educational Stores, Ghaziabad (U.P.) / 2022 / 300 Nos.

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

SELF INSTRUCTION MATERIAL

M.A. URDU (IV SEMESTER)

COURSE NO: 405

UNIT I-IV

PROF. MOHD RAYAZ AHMED
COURSE CO-ORDINATOR P.G. URDU (DDE)
H.O.D DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF JAMMU, JAMMU.

DR. IFTAKHAR AHMED
TR. INCHARGE P.G. URDU
D.D.E. UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU.

http:/www.distanceeducationju.in

(C) All copyright privileges of the material vest with the Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu-180006